کاروانِ حیات

مع

قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک
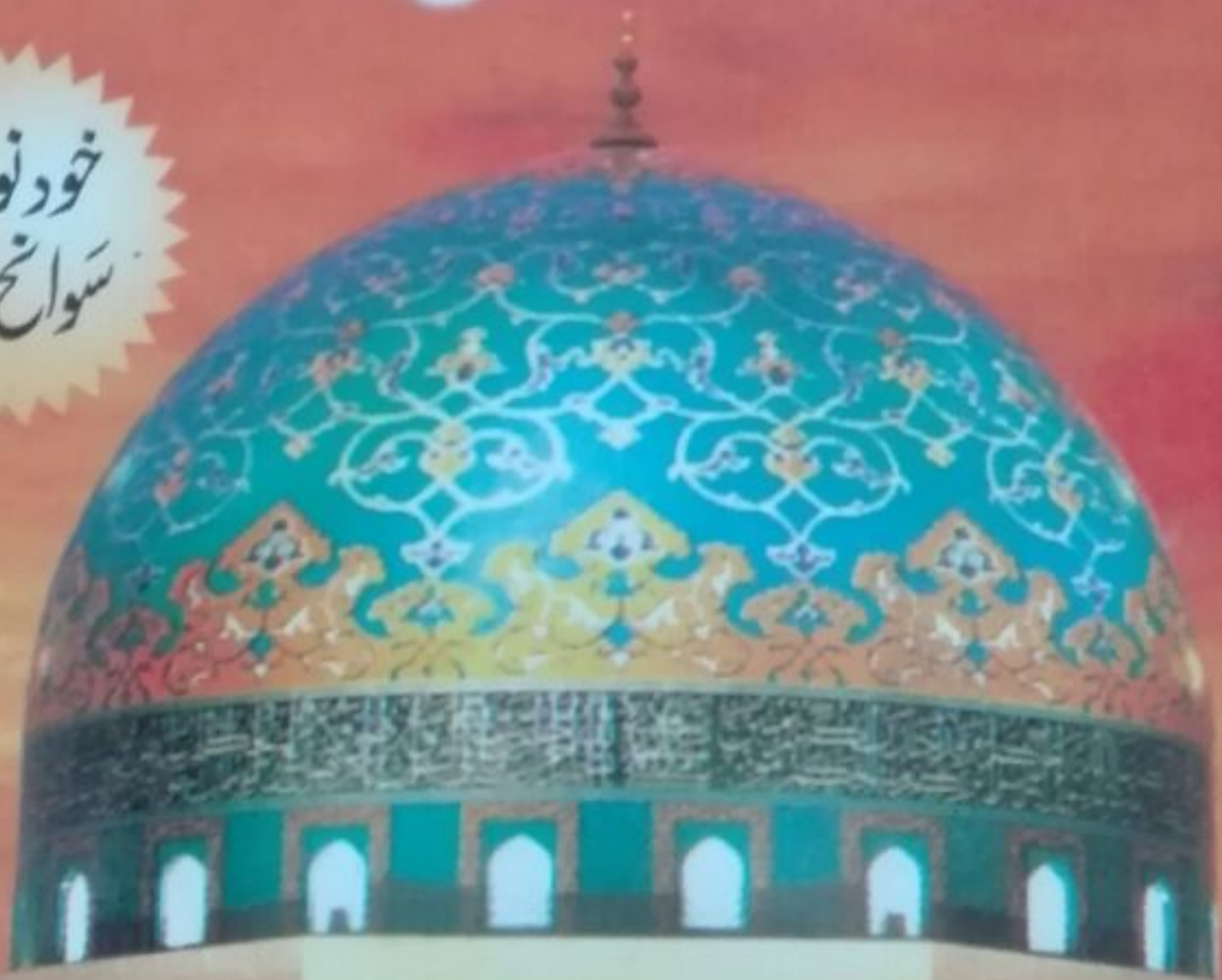
مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

کاروانِ حیات (خودنوشت سوانح)

مع

قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

مولف

مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

(م:۱۶؍جولائی ۱۹۹۶ء)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ لمیٹڈ) نئی دہلی

FARID BOOKDEPOT(pvt)Ltd

New Delhi-110002

تفصیلات

نام کتاب	:	**کاروانِ حیات** (خودنوشت سوانح)
مؤلف	:	حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ
مرتب	:	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات	:	238
طبع اول	:	نومبر ۲۰۰۳ء
زیرنگرانی	:	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
ناشر	:	الحاج ناصر خاں فرید بک ڈپوئی دہلی
قیمت	:	60/=

ای میل: ***zeyaulhaquekbd@gmail.com***

ملنے کے پتے

☆ **مکتبہ ضیاء الکتب**، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی) 9235327576

☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

فہرست مضامین

قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

کاروانِ حیات

امرتسر کا سفر

امرتسر سے لاہور

اخبار ''انصار'' بہرائچ

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں

سفرِ بمبئی

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضانِ تجلی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیرِ اعظم ہوتا ہے

''خطۂ اعظم گڈھ سے متعدد تاریخ ساز شخصیتیں اٹھیں، ان کی انفرادیت اور امتیاز کو علمی دنیا نے تسلیم کیا، وہ آسمانِ شہرت پر نیرِ اعظم بن کر چمکیں، ان کی روشنی دور دور تک پہونچی، مگر طلوع کے غروب بھی قانون، قدرت ہے''

حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ بھی اسی **سلسلة الذهب** کی ایک سنہری کڑی تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وفضل کے جس مرتبۂ بلند پر فائز کیا تھا، اسے ایک دنیا جانتی ہے، خصوصاً عرب وہند کے تعلقات پر وہ ایک سند اور اتھارٹی تھے، اس موضوع پر ان کی تصانیف سب سے مستند مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، تقریباً نصف صدی تک تحریر وتصنیف کے ذریعہ علم وتحقیق کے بیش قیمت موتی لٹانے کے بعد بالآخران کے لئے بھی **إنک میت وإنهم میتون** کا ''ناگزیر وقت'' آہی گیا، اور آج سے سات سال قبل ۱۹۹۶ء میں ماہِ جولائی کی ۱۴؍تاریخ کوانھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور تلاش وتحقیق کی بزم سونی ہوگئی۔

قاضی صاحب نے ایک طویل علمی زندگی گذاری، ان کے زندگی میں بڑے نشیب وفراز آئے، بسا اوقات تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ معاشی تنگیاں اور خانگی دشواریاں ان کے قدم کو علم وتحقیق کے کاموں سے ہٹا دیں گی، مگر دست قدرت نے یاوری کی اور قاضی صاحب کو وہ ہمت وحوصلہ بخشا کہ انہوں نے راہ کی تمام دشواریوں

کا نہایت خندہ پیشانی اور پورے صبر واستقامت کے ساتھ مقابلہ کیا، اور اپنے آپ کو شمع علم کے لئے پگھلاتے رہے، اور یہ ثابت کر دیا کہ انسان چھوٹی جگہ رہ کر اور نا موافق اور نا مساعد حالات میں گھر کر بھی اپنا تشخص وامتیاز قائم کرسکتا ہے، اور اپنا ایک منفرد مقام بنا سکتا ہے، چنانچہ وہ وقت بھی آیا جب انہیں تاریخ ہند کا سب سے معتبر و مستند مورخ تسلیم کیا گیا اور انہیں ''محسن سندھ'' جیسے خطابات سے نوازا گیا، قاضی صاحب کے علم وفضل اور انکی علمی خدمات کا اعتراف علماء عرب وعجم ہر ایک نے کیا، ان کی عربی تصانیف قاہرہ اور ریاض سے نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئیں، اور یورپ وامریکہ کے علمی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئیں، خود عربوں نے ان کی اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر کے شائع کیا۔

قاضی صاحب کا سفر تلاش وتحقیق کی دنیا میں تادم آخریں جاری رہا، انہوں نے جس بے سروسامانی کے عالم میں اپنے علمی سفر کا آغاز کیا تھا، اور انکی جہد مسلسل اور سعی وکاوش کی وجہ سے اس کا جس قدر شاندار اور قابل رشک اختتام ہوا، وہ بعد کے لوگوں کے لئے ایک نمونۂ راہ اور منارۂ نور ہے، جس کی روشنی میں مستقبل کے محققین کے لئے منزلوں تک رسائی بڑی سہل ہو جائے گی،

قاضی صاحب جس پایہ کے عالم اور محقق تھے، اور علم وفضل کے جس بلند مقام پر فائز تھے اگر کسی زندہ قوم کے درمیان ہوتے تو نہ جانے انکی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کتنے مجلدات تیار ہو چکے ہوتے، مگر ہمارے علم کے مطابق ان کی یاد میں صرف ایک مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس کا خاص نمبر ''مؤرخ اسلام نمبر'' شائع ہوا ہے، جس کے مدیر قاضی صاحب کے دیرینہ ومخلص رفیق جناب مولانا اسیر ادروی صاحب ہیں، انہیں اس بات کی شکایت رہی کہ اس نمبر کیلئے اہل علم کی طرف سے انہیں خاطر خواہ تعاون نہیں مل سکا،

اس کے سات سال بعد ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ نے قاضی

صاحب کی حیات وخدمات پر ایک وقیع نمبر ''قاضی اطہر نمبر'' شائع کیا، اس خاص نمبر کو ایک خاص، بہت ہی خاص چیز شائع کرنے کا شرف حاصل ہوا، وہ قاضی صاحب کی ناتمام خودنوشت آپ بیتی ہے، جس کا ایک حصہ قاضی صاحب نے ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے عنوان سے شائع کردیا تھا، یہ حصہ بہت مقبول ہوا۔ علماء نے بھی، طلبہ نے بھی اسے خوب پڑھا، اور خوب سبق لیا، اس کا دوسرا حصہ کاروان حیات کے نام سے قاضی صاحب لکھ رہے تھے، مگر اسے تمام کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ کاروان حیات کا سفر ہی تمام ہوگیا، لیکن جتنا ہے، وہ خود بہت ہے، اسے شائع کرنے کے بعد خیال ہوا کہ اسے کتابی شکل میں شائع کردیا جائے تاکہ اس کا نفع عام ہو،، اس میں ''کاروان حیات'' کے دور اول کا مطبوعہ حصہ ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کو بھی شامل اشاعت کردیا گیا ہے۔ تاکہ ساری خودنوشت داستان حیات یکجا آجائے ،اسی کے ساتھ چند مضامین کو اور شامل کردیا گیا ہے جس سے قاضی صاحب کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے، اس میں ایک تو خود قاضی صاحب کا سفرنامہ ''اہل حرمین سے ملاقاتیں'' ہے، اس کو شامل اشاعت کرنے کی وجہ یہ ہے:

''ہندوستانی علماء کرام جو زندگی بھر علوم دینیہ کو عربی زبان میں پڑھتے پڑھاتے ہیں، چونکہ انھیں عربی میں گفتگو کرنے کی مزاولت نہیں ہوتی، اس لئے حج کے موقع پر گو کہ ان کی ملاقاتیں عرب علماء سے ہوتی ہیں، لیکن عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار خیال نہیں کرپاتے، اوران کا علم اوران کی ذہانت ''کنز مخفی'' بن کر رہ جاتی ہے، اس بات کا احساس اکثر وبیشتر علماء کو رہا کرتا تھا۔
اسی تأثر کا اظہار محترم احمد غریب صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا تھا، قاضی صاحب جب حج کو گئے، تو وہ عرب علماء سے بے تکلفانہ ملے، ان سے کھل کر اظہار خیال کیا، کیونکہ عربی لکھنے اور بولنے کا انھیں ملکہ تھا۔ اس سے عرب علماء متأثر ہوئے، قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں اسی کی داستان بیان فرمائی ہے۔''

اس مضمون کو پڑھ کر قاضی صاحب کی عربی زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔
دوسرا مضمون ہے ''قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست'' یہ قاضی صاحب کے صاحبزادے قاضی ظفر مسعود صاحب کا ہے،

''یہ قاضی صاحب کے علمی وتحقیقی کارناموں کی مکمل اور جامع فہرست ہے اس میں ان کی تمام اُردو اور عربی تصنیفات کے علاوہ جن زبانوں میں دوسروں نے ان کے ترجمے کئے اور جن اداروں نے اپنے طور پر شائع کیا اور جن مخطوطات کی تصحیح وتحقیق کی ان پر تعلیقات لکھیں یا ان کتابوں کے مسودے حوادث کا شکار ہوگئے اور شائع نہ ہوسکے، ہر ایک کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ یہ فہرست اتنی جامع اور مکمل ہے کہ آئندہ قاضی صاحب کے کارناموں پر تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کیلئے بہترین رہنما ثابت ہوگی''

تیسرا مضمون استاذی حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کا ہے، ''قاضی صاحب معاصر اہل علم کے خطوط کی روشنی میں'' اس کی تمہید میں حضرت الاستاذ رقم طراز ہیں:

''قاضی صاحب کو معاصرین کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ قاضی صاحب کا رتبہ ان کے نزدیک کیا تھا؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان مکاتیب ومراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو معاصر علماء نے انھیں لکھے ہیں، قاضی صاحب کی عظمت یہاں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے خطوط کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، ملک کے بہت سے نامور علماء اور بڑے اصحابِ علم نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ان معاصر علماء کے خطوط کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں''

چوتھا مضمون اس خاکسار کا ہے ''قاضی صاحب اور اہل سندھ'' اس کی تمہید میں میں نے لکھا:

''قاضی صاحب کا خصوصی موضوع ''عرب وہند کے تعلقات'' ہیں، ان کی کتابوں میں ہندوستان کے اندر اسلام کی پہلی چار صدیوں کی تاریخ ہے جس کا زیادہ تر تعلق سندھ ومکران وغیرہ سے ہے، اس لئے اہل پاکستان (سندھ) نے اسے اپنی تاریخ قرار دیا، اور اب تک اس علاقہ اور اس دور کی اتنی مفصل ومرتب تاریخ نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کو ایک نادر دریافت کی حیثیت حاصل ہوگئی، سکھر کی فعال ومتحرک تنظیم ''تنظیم فکر ونظر'' نے ان تمام کتابوں کو نہایت اعلیٰ معیار پر شائع کیا اور اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا، اور اس کے رسم اجراء کے موقع پر مصنف کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا اور ان کی حد درجہ عزت افزائی کی، اور انھیں ''محسن سندھ'' کا خطاب دیا، اس مضمون میں ہم اہل سندھ کے مکاتیب، تحریروں اور ان کے بیانات کے اقتباسات پیش کریں گے، جس سے قاضی صاحب کے تئیں اہل سندھ کی شیفتگی ووارفتگی اور عقیدت ومحبت کا پتہ چلتا ہے''

خدا کرے قاضی صاحب کی زندگی کی یہ سبق آموز داستان حیات پڑھ کر ہمارا حوصلہ لہرائے، جذبۂ شوق کو مہمیز ہو، ہمتوں میں بلندی اور عزائم میں استحکام پیدا

ہو، اور ہمارے اندر بھی کچھ کر گذرنے کا ولولہ اور جذبہ بیدار ہو جائے۔

میں الحاج ناصر خاں صاحب (مینجنگ ڈائرکٹر فرید بک ڈپو، دہلی) کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس غیر معمولی اہمیت کی حامل کتاب کو شائع کر کے اس سے استفادے کی راہ آسان کردی، **فجزاکم اللہ احسن الجزا**

ضیاء الحق خیرآبادی

اڈیٹر ماہنامہ ضیاء الاسلام واستاذ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ

یکم/ اکتوبر ۲۰۰۳ء مطابق ۴/ شعبان ۱۴۲۴ھ بروز چہار شنبہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ

قاضی اطہر مبارکپوری؟ آنے والی نسل کو جاننا چاہئے کہ قاضی اطہر مبارکپوری کون تھے؟ اور کیا تھے؟ وہ سراپا جہد وعمل تھے، وہ ایک پیکر صبر واستقامت تھے، حالات نے ان کی مخالفت کی، مگر ان کی ہمت مردانہ اور توفیق الٰہی نے ہر مخالفت کو موافقت پر مجبور کردیا۔ ان کا خمیر علم وتحقیق سے اٹھا تھا، اور تازندگی وہ اس میں تازگی اور پختگی پیدا کرتے رہے، وہ طالب علم تھے، اور جب وہ علماء کی صف اول میں پہونچ گئے تھے جب بھی وہ طالب علم ہی تھے، علم کے سمندر میں وہ گھستے رہے، ایک سے بڑھ کر ایک وہ علم وتحقیق کے موتی نکالتے اور طالب علموں کے دامن میں ڈالتے رہے، مگر کہیں رکے نہیں، ہر قدم وہ آگے بڑھتے رہے، علم کی آغوش کشادہ ہوتی رہی، اور وہ علم وفن کی جلوہ طرازیوں میں گم ہوتے رہے، زندگی کی آخری سانس تک وہ طالب علم رہے۔

وہ دیار پورب کے لئے مایۂ افتخار تھے، نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے علماء کا انھوں نے سر اونچا کیا، کتنے لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ وہ متقدمین میں کی کوئی قدآور شخصیت ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہی درمیان رہے، گھل مل کر رہے، بغیر کروفر کے رہے، ہر طبقہ کے لوگوں نے سمجھا کہ وہ ہمیں میں ہیں، اصحاب تحقیق میں پہونچے، تو انھیں پیشوا مانا گیا۔ اہل تدریس میں گئے، تو بہترین مدرس سمجھے گئے، شعروادب کی وادی میں گئے تو

اسی دنیا کے محسوس ہوئے، تالیف وتصنیف کے میدان میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا کہ

ع: عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

تقریریں بھی خوب کیں! گوکہ ان کی تقریریں سادہ ہوتیں، مگر معلومات سے لبریز ہوتیں، طالب علموں میں ہوتے، تو طالب علم معلوم ہوتے، حد تو یہ ہے کہ عوام میں ہوتے اور ان سے گفتگو کرتے، تو ہر ایک اپنے کو ان کے قریب پاتا۔

ولیس علی اللہ بمستنکر أن یجمع العالم فی واحد

(اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ وہ شخص واحد میں ایک دنیا کی دنیا سمیٹ کر رکھ دے)

قاضی صاحب کی شخصیت کچھ ایسی ہی نمونۂ قدرت الٰہی تھی۔

۱۴؍جولائی ۱۹۹۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ علم وتحقیق کی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوا، حق یہ تھا کہ اس خلا کو ان کی یادوں سے، ان کے کارناموں کے تعارف وتبصرے سے، ان کے احوال زندگی کی تحریر وتصنیف سے کسی قدر پر کیا جاتا۔ تاکہ اصحاب توفیق انھیں دیکھ دیکھ کر اپنی راہیں درست کرتے، جہد وعمل کا حوصلہ پاتے، صبر واستقامت کی عزیمت سے سرفراز ہوتے، اگلوں کے احوال سناتے رہنا چاہئے تاکہ پچھلے راہ میں تھک کر بیٹھ نہ رہیں۔

ابھی ادارہ ضیاء الاسلام نے قاضی صاحب کی یاد میں ایک خاص نمبر کی اشاعت کا اہتمام کیا، اس میں قاضی صاحب کی غیر مطبوعہ خودنواشت سوانح ''کاروان حیات'' پہلی مرتبہ شائع ہوئی، اب عزیزم مولانا ضیاء الحق خیرآبادی سلمہٗ کی سعی وکاوش سے یہ اور مطبوعہ سوانح ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' یکجا کتابی شکل میں شائع ہورہی ہے، باری تعالیٰ ان کی اس سعی وکاوش کو حسن قبولیت سے نوازیں اور ان کے علم وعمل اور نیک ارادوں میں برکت عطا فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی

مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ،

۴؍شعبان ۱۴۲۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسو لہٖ الکریم

خوداعتمادی اور خودسازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے، جو بہترین ذہن ودماغ لے کر دارالعلوموں اور جامعات کی لق و دق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لا ئق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں، مگر عام طور پر ان کو اپنے مقصد میں ناکام ہو نے کے ساتھ اپنی نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے، کیونکہ ان مدرسوں کے ذمہ داروں کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا معیار حد درجہ ناقص بلکہ علم کش ہوتا ہے اور وہ لوگ سارا الزام طلبہ کے سر رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ طلبہ اپنے طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

ایسے طالب علموں کو ہم جیسے چھوٹے مدرسوں کے طلبہ سے سبق لے کر اپنے بلند مقاصد میں کامیابی کی جدوجہد کرنی چاہیئے، میں نے اپنی طالب علمی کی یہ کہانی خودستائی اور خودنمائی کے لئے نہیں لکھی ہے۔ عزیز طلبہ اس تحریر کو اس نقطہ نظر سے نہ پڑھیں بلکہ اس کو پڑھ کر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کریں۔

اس سے پہلے میں نے ''تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کا مقصد بھی عزیز طلبہ کی تشجیع وتشویق ہے۔ اس سلسلہ کی یہ دوسری کتاب ہے ،مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ کی کتاب ''علمائے سلف'' بہت خوب اور بہت مفید ہے، یہ میری محسن کتابوں میں ہے، اسکا مطالعہ بھی ضرور کرنا چاہئے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

یکم ربیع الاول ۱۴۰۷ھ ۵/نومبر ۱۹۸۶ء

خاندانی سلسلہ اور پیدائش

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین محمد و آلہ واصحابہ اجمعین .

میری پیدائش ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍مئی ۱۹۱۶ء میں صبح پانچ بجے ہوئی ، جائے پیدائش مبارک پور کے محلّہ پورہ صوفی اور محلّہ حیدرآباد کے نقطۂ اتصال پر موجودہ مسکونہ مکان کے شمال میں سڑک کے بعد چوتھا مکان ہے ، بعد میں ہم لوگ اس سے پہلے تیسرے مکان میں آگئے ، جس میں میرے بچپن ، جوانی اور طالب علمی کا پورا دور گذرا ، باہر والا کمرہ میرے لئے مخصوص تھا میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۲۶؍رجب ۱۳۵۹ھ نے میرا نام عبد الحفیظ رکھا ، بعد میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوا ، والد مرحوم کا نام شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی متوفی ۱۱؍ربیع الاول ۱۳۹۸ھ ہے اور والدہ مرحومہ کا نام حمیدہ بنت مولانا احمد حسین بن شیخ عبدالرحیم بن شیخ جمال الدین متوفیہ ۲۲؍ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ ہے ، رحمہم اللہ اجمعین ، دادا یہال اور نانہال کے بزرگوں کے حالات ''مآثر و معارف'' اور ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' میں درج ہیں ۔

اس زمانہ میں نانا مرحوم ڈھاکہ میں مدرس تھے اور وہاں کے مشہور و معمر بزرگ حضرت شاہ عبداللہ صاحبؒ ساکن رمنہ نے ان کو میری اور میرے ماموں عبدالباری مرحوم کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور ہم دونوں کے حق میں دعائے خیر بھی کی تھی ۔

میرے جد اعلیٰ سلطان نصیر الدین ہمایوں کے دور سلطنت میں کڑا مانک

پور سے حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجی سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوریؒ متوفی ۲ رشوال ۹۶۵ھ بانیٔ مبارک پور کے ہمراہ اپنا حسب ونسب چھوڑ کر یہاں آئے، اور اسی زمانہ میں نیابت قضاء کا عہدہ ہمارے خاندان میں چلا آرہا ہے، جس کی خو، بواب بھی خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد میں پائی جاتی ہے، اور غیرت وحمیت، عزت نفس، صاف گوئی اور خودداری کا لحاظ و پاس بہت زیادہ ہے، انتہائی بچپن کے چند ایسے واقعات مجھ کو اب تک یاد ہیں جن سے میری غیرت وحمیت کو ٹھیس لگی تھی اور آگے چل کر ان سے خودداری کو مدد ملی۔

ہمارا خاندان بہت بڑا تھا، والد مرحوم چار بھائی تھے (عبداللہ، اسداللہ، محمد حسین اور محمد حسن) والد مرحوم ان میں سب سے چھوٹے تھے اور میں ان کی پہلی اولاد تھا، اس لئے خاندان کے تمام چھوٹے بڑے مجھ سے زیادہ محبت کرتے تھے۔

میں خاندان اور محلّہ کے لڑکوں کے ساتھ میں ہر قسم کے کھیل کود، صید و شکار، سیر وتفریح اور طفلی شرارتوں میں شریک رہ کر ان کو غلط حرکتوں سے منع کرتا تھا، اس لئے وہ سب مجھے ''مولوی'' کہتے تھے حتی کہ اسی زمانہ میں محلّہ کے دوسرے لڑکے اور بڑے لوگ بھی مجھ کو اسی خطاب سے یاد کرنے لگے، کھیل کود کے سامان بنانے میں زیادہ دلچسپی رہتی تھی، چڑیے اور مچھلی کے شکار سے خاص شغف تھا اور خاندانی بھائیوں کے ساتھ قصبہ کے باہر باغوں، کھیتوں، دیہاتوں اور ندی نالوں کا چکر کاٹتا تھا، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم تک یہی حال رہا اور کھیل کود میں زیادہ وقت گذرتا تھا، خاندانی ماحول غیر علمی تھا، چار بھائیوں میں دونوں چھوٹے بھائی معمولی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور دینی زندگی بسر کرتے تھے، میں بچپن میں بہت سیدھا سادا تھا، آشوب چشم کی وجہ سے نگاہ بھی کمزور ہوگئی تھی، والدہ مرحومہ کو خاص طور سے میرے بارے میں بہت فکر رہا کرتی تھی کہ یہ بڑا ہو کر متاہل زندگی کیسے بسر کرے گا، اس کا ذکر دوسروں سے بھی کیا کرتی تھیں، میری نانی مرحومہ رحیمہ بنت حافظ شاہ نظام الدین سریانویؒ متوفیہ ۲۶ر

رمضان ۱۳۷۸ھ بڑی نیک اور عابدہ زاہدہ تھیں، میں نے ان کا دودھ پیا ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں، اکثر صبح کو رسولپور منگوالیا کرتی تھیں اور شام کو مبارک پور واپس کرا دیا کرتی تھیں یہ خدمت ان کے یہاں پڑھنے والے بعض لڑکے انجام دیتے تھے۔

میرا حافظہ بچپن میں بہت قوی تھا، چھ ماہ اور سال بھر کی عمر کے کئی واقعات اب تک یاد ہیں۔ والدہ مرحومہ مجھے گود میں لے کر صبح کو قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتی تھیں اور میں سنتا تھا، نیز محلّہ کے لڑکے لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں، اس وجہ سے بچپن سے مجھ کو دینی اور مذہبی معلومات سے دلچسپی ہوگئی تھی، اور انبیاء علیہم السلام، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بزرگان دین رحمہم اللہ کے حالات سے فی الجملہ واقفیت بھی ہوگئی تھی، اور والدہ مرحومہ کی کتابیں الٹتا پلٹتا تھا، اس طرح ان کی گود میرا پہلا مدرسہ تھی، نو دس سال کی عمر سے نماز کی پابندی ہوگئی تھی۔ الغرض والدہ مرحومہ اور نانی مرحومہ دونوں کی پرورش اور تربیت میں میرا بچپن گذرا ہے جن کا ذہن و مزاج اور ماحول سراسر دینی علمی، خدا پرستی اور خدا ترسی کا تھا، جب کہ خاندان اور محلّہ کا ماحول اس سے جداگانہ تھا میں نے ان ہی متضاد حالات میں آنکھ کھولی اور ان سے میرا بچپن متاثر ہوا، میرے مزاج کی نرمی اور گرمی ان متضاد تاثرات کا نتیجہ ہے جس کا ظہور اب بھی کبھی کبھی ہوتا رہتا ہے۔

باقاعدہ تعلیم کی ابتداء:۔ ویسے تو میں گھر پر ہی کچھ نہ کچھ پڑھنے لگا تھا مگر باقاعدہ تعلیم کے لئے محلّہ کے گھریلو مکتب میں بھیجا گیا، اس زمانہ میں عام طور سے قاعدہ بغدادی، قرآن شریف اور اردو کی ابتدائی تعلیم اور تربیت خانگی مکاتب میں ہوا کرتی تھی، گھر پر والدہ مرحومہ اور والد مرحوم سے پڑھا کرتا تھا، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں داخل کیا گیا، اس وقت تیسرا پارہ پڑھ رہا تھا، حافظ علی حسن صاحب مرحوم سے قرآن شریف پڑھ کر ختم کیا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، مدرسہ جانے سے پہلے

ہی اردو پڑھنے کی شدبد پیدا ہوگئی تھی، قرآن شریف ختم کرنے کے بعد اردو کی تعلیم منشی عبدالوحید صاحب لاہرپوری مرحوم سے حاصل کی جنھوں نے مبارک پور میں آباد ہوکر پوری زندگی مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کی، ریاضی کی تعلیم منشی اخلاق احمد صاحب متوفی ۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ سے مدرسہ میں حاصل کی۔

اس زمانہ میں مجھے رنگین کاغذات، نقشہ جات، مختلف قسم کے پیسے اور سکے جمع کرنے کا شوق ہوا، ماچس کی ڈبیاں بھی جمع کرتا تھا، گھر کے صحن میں مختلف قسم کے پودے اور پھول بویا کرتا تھا، دوسرے کھیلوں کے ساتھ کبوتر بازی کا شوق ہوا تو کئی سال تک یہ مشغلہ جاری رہا جس کی وجہ سے مدرسہ میں ناغہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ الد مرحوم نے خوب خوب مارا، اور گھسیٹتے ہوئے مدرسہ لے گئے، اس کے بعد بالکل سیدھا ہوگیا اور باقاعدہ مدرسہ جانے لگا، اسی زمانہ میں اردو کی کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور ادھر ادھر سے کتابیں تلاش کرنے لگا ۱۳۴۶ھ میں نانا مرحوم کی کتاب ''سبیل الآخرت'' پہلی بار چھپ کر آئی جس کے پڑھنے اور سننے سے والدہ مرحومہ کی طرح مجھ پر بھی موت، قبر اور قیامت کا خوف طاری ہوگیا جس کا اثر اب بھی باقی ہے۔

فارسی کی تعلیم مولانا نعمت اللہ صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۲۸/ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ سے حاصل کی، اردو عربی کی خوش نویسی بھی ان ہی سے سیکھی، الغرض تقریباً پندرہ سال کی عمر تک کھیل کود کر اردو فارسی کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد عربی تعلیم کا دور آیا۔

صفر ۱۳۵۰ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ تقریباً دس سال میری عربی تعلیم کا زمانہ ہے جس وقت عربی شروع کی میری عمر چودہ، پندرہ سال کی تھی، جو عنفوان شباب کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں بچپن کی تمام بالقوۃ صلاحیتیں بالفعل ہوجاتی ہیں، اگر اس زمانہ میں ماحول سازگار ہو تو انسان سب کچھ ہوسکتا ہے، ورنہ محرومی ہوتی ہے، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی استعداد و صلاحیت، احوال و ظروف کی ناسازگاری کے

باوجود اپنا کام کرتی ہے، میں اپنے کو اسی طبقہ کے خوش نصیبوں میں شمار کرتا ہوں۔

والدہ کا انتقال اور پریشانیوں کی ابتداء:۔ اردو فارسی کی تعلیم تک شہنشاہیت کا دور تھا، والدہ مرحومہ کا ذہن ومزاج خالص دینی وعلمی تھا، گھر میں کفایت شعاری اور سادگی کی وجہ سے بڑی خیر وبرکت کا دور تھا کاروبار بھی اچھا خاصا تھا۔ ۱۳۵۲ھ میں جب کہ میں کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا، والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا جس کے صدمہ سے میری اٹھتی جوانی خاک میں ملنے لگی، سالوں غم واندوہ کی وادی میں بھٹکتا رہا، معلوم ہوتا تھا کہ والدہ مرحومہ کی یاد میں اپنے کو بھول جاؤں گا، والد مرحوم بہ سلسلہ معاش ومعیشت باہر آنے جانے لگے، تین بھائی اور ایک بہن میں سب سے بڑا میں تھا، تعلیم کے لئے باہر نکلنا مشکل تھا، نیز بعض دوسرے خانگی معاملات پریشان کن تھے، حتیٰ کہ تعلیم بند کردینے کی بات ہونے لگی، مگر میں نے گھر کے کام کاج کے ساتھ بڑے صبر واستقامت اور شوق ومحنت سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا، اور مدرسہ احیاء العلوم میں پوری تعلیم حاصل کی، صرف آخری سال دورۂ حدیث کے لئے جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد گیا، درمیان میں ۱۳۴۵ھ میں جامعہ قاسمیہ "گیا" گیا تھا، مگر دو ماہ کے بعد واپس چلا آیا تھا۔

میرا تعلیمی ماحول: میری تعلیم کا پورا زمانہ مبارکپور میں گذرا ہے، اس زمانہ میں قصبہ اور سواد قصبہ میں متبحر علماء ومدرسین اور مصنفین موجود تھے اور تقریباً سب ہی حضرات دوسرے مقامات میں علمی ودینی خدمت انجام دیتے تھے، ان میں سے کسی سے نہ استفادہ کی عمر تھی اور نہ موقع تھا۔ البتہ بعد میں ان کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ سن کر علمی حوصلہ پیدا ہوا، اور ان سے رہنمائی ملی۔

ان میں مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوریؒ (نانا مرحومؒ کے بڑے بھائی) متوفی ۱۳۴۱ھ صدر المدرسین مدرسہ چشمۂ غازی پور کو دیکھا ہے ان کی صورت ذہن میں باقی ہے، اپنے وقت کے جید عالم، مفتی، مدرس، طبیب اور مصنف تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۴۲ھ مصنف سیرۃ البخاری، مدرس دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی خدمت میں ایک مرتبہ والد مرحوم کے ساتھ نبض دکھانے گیا تھا۔

شمس العلماء مولانا ظر حسن صاحب فاروقی مبارکپوریؒ متوفی ۱۳۴۷ھ ڈھاکہ میں مدرس تھے اور نانا مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے، ان کی زیارت نصیب نہ ہوسکی۔

مولانا عبدالحق صاحب املویؒ متوفی ــــھ مترجم تلبیس ابلیس مستقل طور سے مدرسہ میاں صاحب دہلی میں رہتے تھے اور وہیں فوت ہوئے، ان کی زیارت بھی نصیب نہ ہوسکی۔

مولانا محمد احمد صاحب لُہراویؒ متوفی ۱۵؍شوال ۱۳۶۸ھ اس زمانہ میں علماء کی ایک جماعت لے کر ''تحفۃ الاحوذی'' کی تبییض کرنے میں لگے رہتے تھے، ان کی خدمت میں بہ سلسلہ علاج آتا جاتا تھا، کبھی کبھی یوں ہی چلا جاتا تھا، ایک مرتبہ مولانا نے پوچھا کون کون کتابیں پڑھتے ہو، میں نے کتابوں کا نام بتایا تو فرمایا منطق میں بہت پیچھے ہو، اس میں محنت کرو، ان کی علمی مشغولیت اور تصنیفی انہاک دیکھ کر لکھنے پڑھنے کا حوصلہ ملا۔ ان کی زبان سے پہلی بار عربی کا مقولہ سنا تھا، **من ساوىٰ يوماه فهو في الخسران** ''یعنی جس انسان کے دونوں دن برابر ہوں وہ نقصان میں ہے، ہر اگلا دن پچھلے سے بڑھا ہونا چاہئے، یہ جملہ آج تک کام دے رہا ہے۔

مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادیؒ متوفی ۲؍ذوالحجہ ۱۳۷۲ھ مصنف ''الافاضۃ القدسیۃ فی المباحث الحکمیۃ'' ''نسیم الکلام فی تائید شریعۃ خیر الانام'' وغیرہ منطق، فلسفہ اور علم کلام کے بے مثال عالم و فاضل تھے۔ استاذ الاستاذ بھی تھے، اس زمانہ میں اکثر وطن ہی میں رہتے تھے، نانا مرحوم کے مخلص احباب میں تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا وہ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس

خالص علمی ہوتی تھی۔

میرے نانا **مولانا احمد حسین صاحب** رسولپوریؒ متوفی ۲۶/ رجب ۱۳۵۹ھ متبحر عالم، مدرس ومصنف اور طبیب حاذق، عربی کے ادیب اور صاحب دیوان شاعر تھے، ڈھاکہ میں پڑھاتے تھے، تعطیلات میں گھر آتے تو رات دن کتب بینی، تصنیف وتالیف اور دواسازی اور کام کاج میں مصروف رہتے، آخر میں چند سال گھر ہی پر رہے، اس زمانے میں مجھے ان کے علمی مشاغل کے دیکھنے کا زیادہ موقع ملا، اور میرے ذوق کو بہت کچھ روشنی ملی، جو میرے گھر ہی کی چیز تھی، ان کے وصال کے وقت میں مراد آباد میں آخری تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

میرے ماموں **مولانا محمد یحیٰ صاحب**ؒ متوفی ۱۱/صفر ۱۳۸۷ھ نہایت ذہین وطباع اور جامع العلوم عالم تھے۔ان کی ذات سے مجھے بے حد فائدہ پہونچا اور انہوں نے میرے علمی ذوق کو بڑی جلا بخشی، میرا علمی سرمایہ ننہال کی دین ہے اور وہیں سے میں نے یہ دولت پائی ہے۔

مولانا حکیم محمد صابر صاحب متوفی ۸/رجب ۱۳۹۹ھ کے خاندان اور میرے ننہال کے درمیان علمی رشتہ بہت پہلے سے تھا، میں ابتدائے طالب علمی ہی سے ان کے یہاں آتا جاتا تھا، انہوں نے مجھے ''وفیات الاعیان لابن خلکان'' کے مطالعہ کا مشورہ دیا، اور اس کی اہمیت وافادیت سے واقف کیا اور اس کتاب سے میں نے خوب خوب استفادہ کیا، اسی زمانہ میں ان کے یہاں سے کئی کتابیں لاکر پڑھیں جس سے عربی شعر وادب کی مزاج شناسی کا ذوق پیدا ہوا۔

ملا رحمت علی اسمٰعیل مبارکپوریؒ متوفی ۱۹۴۴ء بوہرہ فرقہ کے بڑے عالم وفاضل تھے، زندگی کا بیشتر حصہ بمبئی میں گذارا تھا، ملا سیف الدین طاہر سے اختلافات وبغاوت کے بعد ایک جماعت لیکر ان سے مقدمہ بازی کی جو ۱۹۱۷ء غلہ کیس کے نام سے مشہور ہے، ناکامی کے بعد مبارک پور بازار میں بساطے کی دوکان کرلی تھی۔عربی

کے زبردست ادیب وشاعر اور کئی مذہبی کتابوں کے مصنف تھے، مصر، شام، ایران، حجاز وغیرہ کا متعدد بار سفر کر چکے تھے، میں ان کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا، ان کی باتیں علمی اور مذہبی ہوتی تھیں، وہ مجھے اپنی مذہبی قلمی کتابیں مطالعہ کے لئے دیا کرتے تھے تھے، میں نے اسی زمانہ میں مشہور فلسفی شاعر ابوالعلاء معری کے ''رسالۃ الغفران'' کا مطالعہ ان ہی سے لے کر کیا تھا، انہوں نے مجھے جامع ازہر میں داخل کرانے کا وعدہ کیا تھا، مگر وہ خود قاہرہ جا سکے، نہ مجھے جامع ازہر میں داخل کرا سکے، ان کی صحبت سے عربی ادب میں رہنمائی ملی اور بوہرہ فرقہ کی باطنی تعلیمات کا علم ہوا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ میں آمدورفت:۔اس زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں کئی مشہور اہل علم تصنیف وتالیف اور تحقیقی کاموں میں مشغول تھے، مولانا مسعود علی صاحب کی وجہ سے دارالمصنفین ضلع کی سیاسیات کا مرکز بھی تھا، میں کبھی کبھی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں جاتا تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ ادھر ادھر آتے جاتے ہم لوگوں کو دیکھ کر رک جاتے اور خیریت دریافت کرتے، بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے، مگر ان سے یا دارالمصنفین کے کسی عالم سے استفادہ نہیں ہوسکا، ویسے بھی دارالمصنفین دوسروں کے حق میں شجر ممنوعہ ہے۔ البتہ وہاں کی تصنیفات اور رسالہ ''معارف'' سے بہت فائدہ ہوا اور ان سے میرے تصنیفی ذوق کو مدد ملی۔

مدرسہ کا ماحول اور اساتذہ:۔ یہ تھا میرا محدود علمی ماحول جس میں میں نے طالب علمی کے دس سال گزار کر وطن کے علماء ومدرسین سے تعلیم حاصل کی، اور خانگی و معاشی الجھن کی وجہ سے باہر نہ جا سکا۔ اس زمانہ میں مبارک پور شیعہ، سنی اور دیوبندی، بریلوی جھگڑے کا اکھاڑا بنا ہوا تھا، ہر فرقہ کے پہلوان لنگوٹ کس کر میدان میں زور آزمائی کر رہے تھے اور یہاں کے عوام اپنے اپنے علماء کو باہر سے بلا کر اپنے مخالف کو کافر وبددین بنا رہے تھے، مہینوں مہینوں جانبین سے سوال وجواب کی تقریریں ہوتی

تھیں، مناظرے اور مباحثے ہوتے تھے، پھر مار پیٹ اور مقدمہ بازی کی نوبت آتی تھی، عوام وخواص اس میں وقت، صلاحیت اور دولت خرچ کرنے کو عین دین اور کار ثواب سمجھتے تھے، گروہی عصبیت اور جماعتی جانبداری کی وجہ سے انفرادی اور شخصی باتیں پارٹی کا مسئلہ بن جاتی تھیں، دیوبندی جماعت کی سرگرمیوں کا مرکز مدرسہ احیاء العلوم تھا، اس کے علاوہ آئے دن جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے جلسے، تحریکیں اور دوسری ملکی وسیاسی اور مذہبی سرگرمیاں اور ہنگامی حالات، جذباتی اور ہیجانی کیفیت پیدا کرتے تھے اور ہم طلبہ ان سب میں شریک رہا کرتے تھے۔ اس خلفشار وانتشار کے دور میں تعلیم وتعلم کا کام بظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا تھا اور پڑھنے پڑھانے کے لئے جن پرسکون اور اطمینان بخش حالات کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود تھے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہی دور مدرسہ احیاء العلوم کا زرّیں عہد ہے۔ مدرسہ میں اس سے پہلے نہ ایسی رونق وبرکت تھی اور نہ بعد میں آئی، یہاں کی تعلیم وتربیت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، اس دور کا ہر طالب علم آگے بڑھنے کی کوشش کر کے اپنے آپ کو کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا تھا۔ یہ سب قصبہ کے ان اساتذہ کے خلوص وایثار کا فیض تھا جو دس بارہ روپئے سے بیس روپئے تک کے قلیل مشاہرہ پر صبر وقناعت کر کے اور حساب کم وبیش سے یکسو ہو کر رات دن پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ایک دن میں دس دس بارہ بارہ اسباق پڑھاتے تھے، مدرسہ کے خارج اوقات میں طلبہ کو اپنے گھروں پر بلا کر عمدہ تعلیم اور بہترین تربیت دیتے تھے، خود محنت کر کے طلبہ سے محنت کراتے تھے، وہ حریص تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آ جائے، استادی شاگردی کے تعلقات بالکل عزیزانہ نوعیت کے تھے۔

مدرسہ احیاء العلوم کے اساتذہ:۔ مدرسہ احیاء العلوم کے عربی اساتذہ میں مولانا مفتی محمد یٰسین صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۲۲ر محرم ۱۴۰۴ھ میرے سب سے پہلے استاذ ہیں اکثر وبیشتر کتابیں انہیں سے پڑھی ہیں، ان کی سادگی، نیک نفسی، خلوص

اور شفقت سے مجھے بہت فیض پہونچا ہے، منطق و فلسفہ کی زیادہ تعلیم مولانا شکر اللہ صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۵؍ربیع الاول ۱۳۶۱ھ سے حاصل کی، میں ان کا آخری شاگرد ہوں جسے نہایت ذوق وشوق سے پڑھایا، میری ہمت افزائی اور ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوریؒ متوفی ۳؍شوال ۱۴۰۴ھ سے منطق کی بعض کتابیں پڑھی ہیں، مولانا محمد عمر صاحب مظاہری مبارکپوری سے تفسیر جلالین وغیرہ پڑھی ہے۔ ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب رسولپوریؒ متوفی ۱۱؍صفر ۱۳۸۷ھ سے عروض وقوافی اور ہیئت کے بعض اسباق پڑھے ہیں، میری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے، میرے مطالعہ کے لئے عربی کی نادر نادر کتابیں مہیا کرتے تھے، ان کے علاوہ میرے اساتذہ کرام میں کوئی ادیب، شاعر، مصنف اور مضمون نگار نہیں تھا، مگر میں ان ہی سے تعلیم حاصل کر کے سب کچھ ہوا، یہ ان کے خلوص اور میری ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔

جامعہ قاسمیہ (شاہی) مرادآباد کے اساتذہ: ۔جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے اساتذہ وشیوخ میں مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ متوفی ۱۳۹۲ھ سے صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور سنن ابی داؤد، اور مولانا سید محمد میاں صاحب متوفی ۱۶؍شوال ۱۳۹۵ھ سے سنن ترمذی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلیؒ متوفی ۱۳۹۵ھ سے صحیح مسلم پڑھی، درمیان میں ایک مرتبہ دو ماہ تک جامعہ قاسمیہ میں رہ کر مولانا سید محمد میاں صاحب سے دیوان حماسہ کا پہلا باب اور مقامات زمخشری پڑھی، مولانا عربی زبان کے ادیب، اردو کے مصنف اور خالص دینی وعلمی زماج کے آدمی تھے، ان کے خلوص و محبت اور ہمت افزائی سے مجھے بہت فیض پہونچا ہے۔

جمعیۃ الطلبہ کا قیام: ۔اسی زمانہ میں مدرسہ احیاء العلوم میں طلبہ کی فکری و ذہنی تربیت اور وسعت معلومات کے لئے جمعیۃ الطلبہ کا قیام ہوا، اس کے لئے عظیم الشان کتب خانہ قائم ہوا جس میں ہر علم وفن خصوصاً تاریخ وادب کی ہزاروں مستند ومعتبر

کتابیں جمع کی گئیں اور بہت سے علمی ادبی، مذہبی اور سیاسی اخبار ورسائل جاری کرا ئے گئے جن سے طلبہ استفادہ کرتے تھے، اس دور کی تقریباً ہر کتاب میری پڑھی ہوئی ہے ہر جمعرات کو طلبہ سے تقریر کرائی جاتی تھی، جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے ''الاحیاء'' نام کا قلمی رسالہ جاری کیا گیا جس کی ادارت میرے ذمہ تھی۔ مدرسہ کے ناظم اور روح رواں مولانا شکر اللہ صاحب اپنے عزیز طلبہ کی تعلیم وتربیت پر کڑی نظر رکھتے تھے، ان کے اندر عزت نفس، خوداعتمادی، بلندیٔ کردار اور ٹھوس علمی استعداد کا جوہر دیکھنا چاہتے تھے وہ اپنے طلبہ کو علم کے ہر میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جا نے کے حق میں بالکل نہیں تھے، بڑی مشکل سے ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا اس کے باوجود حوصلہ کی بلندی اور تحصیل علم کی دھن کا یہ حال تھا کہ جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا بلکہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بدولت ناکامی کو کامیابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسہ کو جامع ازہر، جامع زیتون، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ مدرسہ مستنصریہ بنالیا، اور وطن میں ہی رہ کر خدا کے فضل وکرم، اساتذہ کی شفقت ومحبت اور اپنی محنت وعزیمت سے بہت کچھ حاصل کیا، اس دور میں مجھ پر عجیب سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی، ہر وقت بغداد وبخارا، اندلس وغرناطہ، اور عالم اسلام کی قدیم مشہور درسگاہیں اور ان کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں ان کے حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔

طالب علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہو تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا ہوسکتا ہے، اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا، مجھے کسی بڑے علمی وتحقیقی اور تربیتی ادارہ کی ہوا تک نہیں لگی نہ کسی بڑی شخصیت کی رہنمائی حاصل ہوسکی ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی سازگار نہیں تھے، اس

کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے ذوق وشوق، محنت وحوصلہ اور خودسازی کے بل پر وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا جاتا ہے، ہوسکتا ہے جیسا کہ ہوتا بھی ہے کہ مجھے کسی بڑی شخصیت یا ادارہ کے سایہ میں جگہ ملتی تو میرا علمی پودا قوت نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب وہوا میں اسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بارور ہونے کا موقع میسر نہ آتا۔

درس نظامیہ کی افادیت:۔ اس میں شک نہیں کہ درس نظامیہ میں بہت کچھ کتر بیونت کے باوجود اب بھی وہ بہت مفید اور کارآمد ہے، کئی مدارس نے اپنے یہاں نئے نصاب جاری کئے مگر نتیجہ کے طور پر ان سے ایسے علماء پیدا نہیں ہوئے جو درس نظامہ کے فضلاء کی صف میں بیٹھ کر ٹھوس تعلیمی و تصنیفی خدمات انجام دے سکیں اور دینی علوم وفنون میں مستند فکر اور معتبر نظر رکھتے ہوں، حالات اور تقاضے کے مطابق نصاب میں تغیر وتبدل ہونا چاہئے، مگر طلبہ میں پختہ علمی استعداد وصلاحیت اور اعتقاد و عمل میں صلابت کا خیال مقدم ہونا چاہیئے، کیونکہ دینی مدارس کے وجود کا مقصد یہی ہے، اسی نام سے وہ جاری ہیں، اور یہی ان کا اصل کام ہے، میں نے مجموعی طور سے اسی درس نظامیہ کو پڑھا ہے اور مجھے جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔

قوت مطالعہ کی برکت:۔ ابتداء میں عربی تعلیم مجھے سخت اور مشکل معلوم ہوتی تھی، مدرسہ سے اکثر غائب رہا کرتا تھا اس میں اپنی کچھ بے پرواہی اور سمجھ کا قصور اور کچھ طریقہ تعلیم کا قصور تھا۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ کئی ماہ تک مدرسہ نہیں کیا، حالانکہ بچپن ہی سے عربی زبان سے یوں مناسبت پیدا ہوگئی تھی کہ روزانہ صبح کو مترجم قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا اور ترجمہ کی روشنی میں عربی کے اردو معنیٰ پر غور کرتا تھا، میزان، منشعب، علم الصیغہ اور نحو میر پڑھنے کے بعد جمعہ کا خطبہ سمجھنے لگا تھا، نحوی اور صرفی قواعد کی خوب مشق کی، بعد میں کبھی کبھی علم الصیغہ اور نحو میر پڑھ لیا کرتا تھا، نیز فصول اکبری کی خاصیت ابواب خوب یاد کر لی تھی۔ ان کتابوں کے قواعد و

مسائل آج بھی تقریباً اسی یاد ہیں اور کام آتے ہیں ، بعد میں جب مقامات حریری بحاشیہ مولانا محمد ادریس صاحبؒ کے دس مقامات ان کے پورے حقوق کے ساتھ پڑھے تو عربی زبان وادب کا صحیح ذوق پیدا ہوا، اس کے متعلقات ومبادی، مثلاً لغت، اشتقاق، ابواب، صلات ، نحو، صرف ، خاصیات وغیرہ کے بارے میں نظر پیدا ہوئی جس سے درسی اور غیر درسی کتابیں سمجھ میں آنے لگیں اور خود اعتمادی نے ہمت وحوصلہ کو قوت دی ۔ ہمارے اساتذہ بغیر مطالعہ کے سبق نہیں پڑھاتے تھے، طلبہ کے لئے ضروری تھا کہ کل کے سبق کا مطالعہ رات میں کر کے خود معانی ومطالب حل کرنے کی کوشش کریں وہ خود بھی رات کو مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ رات میں تمام درسی کتابوں کا مطالعہ جو عموماً چار ہوا کرتی تھیں، جم کر کیا کرتا تھا، جہاں کام نہیں چلتا تھا استاذ پر چھوڑ دیتا تھا، اس طرح جب قوت مطالعہ پیدا ہوگئی تو یوں آنکھ کھل گئی کہ ایک ہی سال میں منیۃ المصلی ، نورالایضاح ، قدوری، کنز الدقائق اور شرح وقایہ پڑھ لی، شرح وقایہ کا سبق ایک ایک دن میں چھ چھ صفحات تک پڑھ لیتا تھا، ان ہی ایام میں تاریخ الخلفاء شروع کی مگر چند اسباق پڑھ کر چھوڑ دی کیوں کہ وہ کتاب درس کی نہیں بلکہ مطالعہ کی تھی، ایسا بھی ہوتا تھا میں کتاب کی عبارت پڑھ کر کہہ دیتا کہ میں سمجھ گیا اور استاذ آگے پڑھانے لگتے تھے، یہ سب قوت مطالعہ کی برکت تھی جو نحوی وصرفی قواعد کے حفظ و اجراء اور عربی ادب میں محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوگئی تھی ۔۔ جس کے لئے میں نے ابتداء میں خوب محنت کی تھی، اس کے باوجود میں نے اپنے اساتذہ کے بارے میں کبھی گستاخانہ رائے قائم نہیں کی، اور نہ ان کے علم پر حرف گیری، اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسی زمانہ میں اس کی سزا مل جاتی اور ان کے طفیل مجھے یہ علمی فیض نہ پہونچتا۔

نیز زمانہ طالب علمی میں مدرسہ میں دو ایک درسی کتاب پڑھاتا تھا، اور طلبہ نہا یت ذوق وشوق سے پڑھتے تھے جن میں کئی ہمعصر تھے، بعض اوقات میں پڑھانا نہیں چاہتا تھا تو مجھے زبردستی پڑھانے پر مجبور کرتے تھے اس میں بعض مرتبہ مار پیٹ کی نو

بت آجاتی تھی اس طرح طالب علمی کے ساتھ مدرسی کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔ عربی کی کوئی غیر درسی کتاب ہر وقت لئے رہتا تھا سبق اور تکرار کے بعد اس کے مطالعہ میں لگ جاتا تھا، ہمارے مدارس عربیہ کا یہ تغیر کتنا عجیب اور علمی انحطاط کی یہ روکتنی اندوہناک ہے کہ اب سے چالیس پینتالیس سال پہلے ہم جیسے طالب علم اپنے شفیق اساتذہ کی نگاہ میں نالائق اور بداستعداد تھے، وہ کہتے تھے کہ تم لوگوں کو کچھ نہیں آتا، اہل علم کی مجلس میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہو، مدرسہ میں آکر وقت اور عمر ضائع کرتے ہو، اور ہم ان سے بعض اوقات طالب علمانہ انداز میں دبی زبان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ ہمارے بعد ہم کو یاد کریں گے، چنانچہ بالکل یہی ہو رہا ہے۔ قوت مطالعہ پیدا ہو جانے کی وجہ سے پڑھنے میں بڑا انشراح وانبساط پیدا ہو گیا اور غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق جنون و دیوانگی کی حد تک بڑھ گیا، درسی کتابوں میں بس اتنی محنت کرتا تھا کہ امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاؤں، ممتاز یا اول آنے کی کوشش کبھی نہیں کی، مگر اکثر اول ہی آیا، بعض مرتبہ ممتاز بھی رہا، اس کے مقابلہ میں غیر درسی کتابوں سے شغف بہت رکھتا تھا، چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ضرور رہا کرتی تھی، حتی کہ کھانا کھاتے وقت بھی کتاب دیکھتا تھا، راتوں کو درسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کئی کئی گھنٹے تک کیا کرتا تھا، گرمی کی رات میں لالٹین کے سامنے کتاب لئے پڑا رہتا تھا۔ بسا اوقات زبردستی اٹھایا جاتا تھا حالانکہ بچپن سے نگاہ کمزور تھی، عربی شروع کرنے کے بعد عینک کا ستعمال شروع کر دیا تھا بعض اساتذہ از راہ شفقت کہتے تھے کہ اس قدر زیادہ نہ پڑھو ورنہ اندھے ہو جاؤ گے تو میں عرض کرتا کہ اگر ایسا ہو تو خود ہی یہ کام بند ہو جائے گا، کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے بعض اوقات آنکھ میں سوزش پیدا ہو جاتی تھی، دانے نکل آتے تھے اور چکر آنے لگتا تھا جس کی وجہ سے دیر تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا،

میں فقہ کے درس میں اکثر امام شافعیؒ کی حمایت کرتا تھا، اور استاذ مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے اکثر سوچتا تھا کہ متاخرین ائمہ احناف خصوصاً علماء ماوراء النہر کی کتابیں کیوں نہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ قدماء کی امہات کتب کہاں ملیں گی جن میں فقہ حنفی کی صاف ستھری روح موجود ہے اور فروعات کا استخراج احادیث و آثار سے کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعد میں احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد سے شائع ہونے والی ائمہ احناف کی نادر و نایاب کتابوں سے بے حد شغف رہا، ان سب کو جمع کیا اور دل کھول کر ان پر تبصرہ و تعارف لکھا۔ مولانا ابوالوفاء افغانیؒ متوفی ۱۳/ رجب ۱۳۹۵ھ صدر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد متصلب حنفی تھے جنھوں نے یہ کتابیں تلاش کر کے اپنے تعلیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیں، بعد میں انہوں نے ایک مرتبہ میرے سامنے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ علماء ماوراء النہر کی ان کتابوں کو جلادوں ان ہی کے رواج کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام ابویوسف اور دیگر ائمہ احناف رحمہم اللہ کی کتابیں ناپید اور ضائع ہوگئیں اور لوگوں نے ان سے صرف نظر کر کے متاخرین کی کتابوں کو فقہ حنفی کا ماخذ و مدار بنالیا۔ احیاء المعارف النعمانیہ کی کتابوں اور حجۃ اللہ البالغہ کے مطالعہ سے مجھے فقہی مسائل کو احادیث و آثار کی روشنی میں سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا۔

اسی طرح اکثر خیال آتا تھا کہ قرآن و حدیث جو دین کی بنیاد ہیں ان کو درس نظامیہ میں تیسرا درجہ دیا گیا ہے اور ان کو دور اور عبور کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اس خیال کی بناء پر اسی زمانہ میں مشکوٰۃ، تفسیر جلالین اور تفسیر ابن کثیر خرید کر پڑھتا تھا، ساتھ ہی مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد کا مطالعہ کرتا تھا۔

<u>ذہن ساز کتابیں جن کا میں نے مطالعہ کیا</u>:۔ ابتداء مسدس حالی اور علمائے سلف پھر فہرست ابن ندیم اور وفیات الاعیان سے اسلاف کے علمی کارناموں سے واقفیت ہوئی اور ان کے احوال و سوانح سے ان کی تقلید و تتبع کا شوق پیدا ہوا، اسی

زمانہ میں ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ فراغت کے بعد دارالمبلغین لکھنؤ گئے جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وہ میرے لئے مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی کتابیں روانہ کرتے یا لاتے تھے، اور میں ان کو نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا، نیز ردشیعہ کے سلسلہ کی دوسری کتابیں ان ہی سے حاصل ہوئیں۔ اور میرے پاس ان کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، اس کے بعد وہ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں مدرس ہوئے تو وہاں کے کتب خانہ سے میرے لئے کتابیں لاتے تھے اور پھر واپس لے جاتے تھے، ان کے ذریعہ جن کتابوں کے مطالعہ سے مستفیض ہوا ان میں سے یہ چند نام یاد رہ گئے ہیں: **الاستیعاب فی معرفة الاصحاب** ابن عبدالبر، **دلائل النبوة** اصفہانی، **سبحة المرجان فی آثار ھندوستان** غلام علی آزاد بلگرامی، آکام المرجان فی احکام الجان ابو بکر شبلی بغدادی، حیاة الحیوان دمیری، الصواعق المحرقة ابن حجر مکی، **العمدہ فی الشعر ونقدہ** ابن رشیق قیروانی، **المحاسن والاضداد** جاحظ، الشعر والشعراء ابن قتیبہ، **المیزان الکبری** شعرانی وغیرہ۔

مولانا حکیم صابر خاں صاحبؒ کے یہاں سے یہ کتابیں لاکر پڑھیں، فقہ اللغہ ثعالبی، **امثال العرب** ضبی، نقد الشعر ابن قدامہ، **کتاب الصناعتین** عسکری۔

مدرسہ احیاء العلوم کے کتب خانہ سے یہ کتابیں پڑھیں، سیرت ابن ہشام، **وفاء الوفاء للسمھودی** ، **المستطرف** ، دیوان فرزدق، نیز مختلف طریقوں سے ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھایا، وفیات الاعیان ابن خلکان، **کتاب الملل والنحل** شہرستانی، **العقد الفرید** ابن عبدربہ، **رسالة الغفران ابو العلاء معری** ، **تھذیب التھذیب، توالی التاسیس** وغیرہ۔

یہ ان کتابوں کے علاوہ ہیں جن کو میں خریدتا تھا اور رات دن ان کے مطالعہ میں مشغول رہتا تھا، ان کی فہرست آگے آرہی ہے۔ اسی طرح جمعیة الطلبہ کی لائبریری کی تقریباً تمام کتابیں کلی یا جزوی طور پر میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اور میں نے ان

سے استفادہ کیا ہے۔ جس دن کوئی نئی کتاب ہاتھ آجاتی، سب کچھ چھوڑ کر اسی کے مطالعہ میں غرق رہتا تھا، ان کتابوں کے پڑھنے کے ساتھ ان کے منتخبات جمع کرتا، مضامین لکھتا تھا، حالانکہ اس وقت تک ان کتابوں کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی بلکہ بہت سی کتابیں میری استعداد سے کہیں زیادہ بلند تھیں اور ان کو بہت کم سمجھ سکتا تھا جو کچھ اور جتنا سمجھ لیتا تھا اس سے میرے علمی حوصلہ میں بڑی توانائی آجاتی تھی، اور مزید مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

مناظرہ ومباحثہ:۔ اس زمانہ میں ہر منگل کو بازار میں عیسائی مشنری سے تقریری اور تحریری مباحثہ کرتا تھا اور اس سلسلہ میں تورات، انجیل اور رد نصاریٰ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا۔

کثرت مطالعہ اور کتب بینی کی وجہ سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا اس لئے تقریر وخطابت میں بھی مدرسہ کے طلبہ میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، اور قصبہ کے اندر باہر جلسوں میں اساتذہ سے پہلے تقریر کرتا تھا۔

شعروشاعری:۔ ابتداء ہی سے شعروشاعری کا ذوق پیدا ہوا تو اپنے طور پر اچھی خاصی شاعری کرنے لگا اور میرے اشعار مذہبی، سیاسی اور علمی جلسوں میں پڑھے جانے لگے بلکہ چھپنے لگے، اسی کے ساتھ مضمون نگاری بھی اپنے طور پر کرنے لگا اور میرے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے۔

الغرض میں نے کثرت مطالعہ، علمی استعداد، مضمون نگاری، تصنیفی ذوق، شعروشاعری، بحث ومناظرہ، تقریر وخطابت میں شہرت کی حد تک کامیابی حاصل کرلی ۔صلاحیتوں کے دروازے کھل گئے، جولانیٔ طبع اور علمی انبساط ونشاط ہر میدان میں رواں دواں معلوم ہونے لگا اور خود اعتمادی کے ساتھ منزل مقصود تک پہونچا۔ میرے اساتذہ ان باتوں کی وجہ سے بہت خوش رہا کرتے تھے اور میری ہمت افزائی فرماتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری یہ تمام صلاحیتیں ان ہی کے خلوص ومحبت اور مربیانہ تعلیم و

تربیت کا نتیجہ تھیں، وہ خود محنت کر کے اپنے شاگردوں سے محنت لیتے تھے، اور حساب کم وبیش سے یکسو ہو کر اس حرص میں گھلے جاتے تھے کہ ان کے شاگردوں کو علم آجائے۔

مطبوعات کی خریداری اور مخطوطات کی فراہمی:۔ اردو کی تعلیم کے زمانہ ہی سے مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، ساتھیوں سے کتابیں مانگتا اور خود بھی خریدتا تھا، مقامات مقدسہ کے نقشے، مختلف قسم کے نقشے جو اس چھوٹے سے قصبہ میں کہیں سے مل گئے جمع کیا اور ان سب کو لکڑی کی ایک چھوٹی سی صندوق میں جسے والدہ مرحومہ رسول پور سے لائی تھیں بحفاظت رکھتا تھا، اور ہر دوسرے تیسرے دن ان کو نئی ترتیب اور قرینے سے سجاتا تھا، یہ میرا پہلا کتب خانہ یا اسلامی عجائب خانہ تھا۔ عربی شروع کرنے کے بعد کتابی ذوق میں اضافہ ہوا، درسی کتابیں نانا مرحوم کے کتب خانہ سے لاتا تھا جسے دیکھ کر مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوا تھا اور میزان ومنشعب، علم الصیغہ، کافیہ، مرقاۃ، کفایۃ المتحفظ، کنز الدقائق، دیوان متنبّی، مقامات حریری، وغیرہ خریدی اور اردو کتابوں میں تواریخ حبیب الٰہ، الکلام المبین، حدائق البیان، الفاروق وغیرہ منگائیں، رسالہ ''مولوی'' دہلی سے ایک روپیہ سالانہ چندہ میں مستقل طور سے آتا تھا اس کی جلدیں بنا کر رکھتا تھا۔

جب عربی زبان میں کچھ استعداد پیدا ہوئی اور عربی کی غیر درسی کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا تو ادھر ادھر سے کتابیں تلاش کر کے پڑھنے لگا، اسی زمانہ میں ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے میرے پتہ پر اپنے لئے عبدالصمد واولادہ تجار الکتب سید واڑہ سورت سے مصری کتابوں کی فہرست اور کتب خانہ رشیدیہ دہلی کی فہرست منگائی اس کے بعد میں نے بھی اپنے لئے ان دونوں فہرستوں کو منگایا، کچھ دنوں کے بعد ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی، تجار الکتب بمبئی اور المکتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی کی فہرستیں بھی منگالیں۔ کتب خانہ رشیدیہ کے علاوہ سب فہرستیں عربی زبان میں مصر کی چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بعض میرے کتب خانہ میں اب

بھی محفوظ ہیں، ان میں فن وار کتابوں کے نام، مصنف کے نام، مصنف کے نام ونسب، سنہ وفات، کتابوں کے اجزاء اور قیمت کی تفصیل ہوتی تھی، بعض کتابوں کا تفصیلی تعارف بھی ہوتا تھا، اس طور سے یہ فہرستیں بجائے خود عربی مطبوعات اور ان کے مصنفین کا دائرۃ المعارف معلوم ہوتی تھیں، ان فہرستوں سے مجھے علمائے اسلاف کے تصنیفی کارناموں اور مصر وشام وغیرہ کی مطبوعات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں اور میرے علمی ذوق کو رہنمائی ملی، ان کو بار بار پڑھتا اور دیکھتا تھا، پھر اپنے ذوق اور وسعت کے مطابق منتخب کرتا تھا، جی چاہتا تھا کہ کل کتابیں خریدلوں مگر سوال پیسے کا تھا، گھر کی اقتصادی حالت کتابیں خریدنے کی بالکل اجازت نہیں دیتی تھی اس لئے میں نے جلد سازی شروع کردی۔ اور اس کا جملہ سامان مہیا کرے ہر قسم کی جلدیں بنانے لگا، سامان اعظم گڑھ سے لاتا تھا، صبح کو کچے راستے سے پیدل جاتا اور ظہر تک سامان خرید کر آجاتا، آتے جاتے بارہ میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے ہوجاتی تھی، جلد سازی کی آمدنی کتابوں کی خریداری کے لئے محفوظ رکھتا تھا۔ دوسری ترکیب یہ نکالی کہ کتب خانہ رشیدیہ سے تاجرانہ نرخ پر کتابیں منگانے لگا، عام کتابوں پر روپیہ میں چار آنے، مصری کتابوں پر دو آنے اور قرآن شریف اور پاروں پر زیادہ کمیشن ملتا تھا۔ مدرسہ کے طلبہ اور قصبہ کے لوگوں کی فرمائش پر قرآن شریف اور کتابیں منگا کر فہرست کے دام پر دیا کرتا تھا محصول وغیرہ کے بعد کمیشن کی جو رقم بچ جاتی اسے بحفاظت رکھ دیتا اور جب کتابیں منگاتا تو کتاب کی قیمت اور اپنی رقم کا اندازہ کرکے اپنے ذوق کی کوئی کتاب منگالیتا تھا، ہر مہینہ میں دو تین پارسل ڈاک یا ریل سے آتے تھے جن میں میری بھی کوئی کتاب ہوتی تھی، ایسا بھی ہوتا تھا کہ مطلوبہ کتاب کی رقم جمع نہ ہونے کی وجہ سے کئی کئی مہینہ تک میری کوئی کتاب نہیں آتی تھی۔ اس طرح طالب علمی کے دس سالہ دور میں عربی کی نادر ونایاب امہات الکتب اور مصر وشام اور بیروت وغیرہ کی مطبوعات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا، ان کتابوں کے بارے میں

انتظار اور بے تابی کا یہ حال تھا کہ جس دن کتاب آنے والی ہوتی رات ہی کو خواب میں معلوم ہوتا تھا اور ڈاک خانہ یا اسٹیشن جا کر خود پارسل چھڑا کر لاتا تھا۔ یہ دن میرے لئے روزِ عید ہوتا تھا، کئی دنوں تک ہر وقت کتاب ہاتھ میں لئے پڑھتا اور الٹتا پلٹتا رہتا تھا اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتا تھا۔ اس دور کی ہر کتاب پر نماز پڑھی ہے، بلکہ یہ سلسلہ بہت بعد تک جاری رہا۔ پھر اولین فرصت میں اپنے ذوق کے مطابق اس کی جلد بناتا، بعض اوقات جلد ناپسند ہوتی تو دوبارہ جلد بندی کرتا تھا۔ اس دور کی تمام کتابوں کی جلد سازی میرے ہاتھ کی ہے۔ مصنف کا حال تلاش کر کے لکھتا اور کتاب کے اوپر کاغذ کا غلاف چڑھاتا، آج بھی میری تقریباً تمام کتابوں پر کاغذی غلاف چڑھا ہوا ہے۔ نیز ہر کتاب پر اس کی قیمت اور تاریخ خرید لکھتا۔

چند اہم کتب کی خریداری مع قیمت وسنِ خریداری:۔ ذیل میں اس زمانہ کی غیر درسی عربی کی کتابوں کی فہرست مع قیمت و تاریخ کے درج ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح سال بہ سال علمی ترقی اور ذہنی تبدیلی ہوتی رہی اور اس زمانہ میں ان کتابوں کی قیمت کیا تھی۔ اور اب کیا ہوگئی ہے۔

(۱) مختار الصحاح رازیؒ قیمت ایک روپیہ، شعبان ۱۳۵۳ھ میں آئی، یہ میرے کتب خانہ کی مصری مطبوعات میں پہلی کتاب ہے، مولانا شکر اللہ صاحب مدرسہ کیلئے میزان الاعتدال، تذکرۃ الموضوعات اور المستطرف وغیرہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی بمبئی سے منگوا رہے تھے ان ہی کے ساتھ یہ کتاب بھی آئی تھی، بعد میں کئی طالب علموں نے میرے ذریعہ سے اس کو خریدا۔

(۲) ادب الکاتب ابن قتیبہؒ قیمت دو روپیہ (۳) کتاب الاضداد فی اللغۃ ابن بشار انباریؒ، قیمت ایک روپیہ، یہ کتابیں ایک ساتھ رمضان ۱۳۵۳ھ میں عبد الصمد واولادہ تجار الکتب سورت سے آئیں۔

(۴) کتاب المعارف ابن قتیبہؒ قیمت ڈیڑھ روپیہ، رجب ۱۳۵۴ھ میں آئی۔

(۵) دیوان نابغہ ذبیانی، قیمت دس آنے۔(۶) دیوان زہیر بن ابی سلمی مع شرح اعلم شنتری قیمت پانچ آنے (۷) العلم الخفاق فی علم الاشتقاق ،نواب صدیق حسن خاںؒ قیمت چھ آنے ،(۸،۹) دیوان الخنساء مع دیوان حاتم الطائی قیمت غالباً آٹھ آنے ، یہ چاروں کتاب ایک ساتھ شوال ۱۳۵۴ھ میں الکمتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی سے آئی تھیں ۔

(۱۰) مقدمہ ابن خلدون ، قیمت ایک روپیہ چار آنے ،۱۳۵۴ھ کے سالانہ امتحان میں مقامات حریری میں اول آنے پر مولانا مفتی محمد یٰسین صاحبؒ نے ایک روپیہ انعام دیا تھا، چار آنے خود لگا کر یہ کتاب منگائی ۔

(۱۱) دلائل الاعجاز عبدالقاہر جرجانیؒ قیمت غالباً دو روپیہ۔(۱۲) العمدہ فی الشعر ونقدہٖ ابن رشیق قیروانی دو جلدوں میں ، قیمت دو روپیہ، یہ دونوں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے صفر ۱۳۵۵ھ میں آئیں ۔ (۱۳) الاخبار الطّوال ابوحنیفہ دینوری ، قیمت ڈیڑھ روپئے ، (۱۴) طبقات الامم ابن صاعد اندلسیؒ قیمت ایک روپیہ پانچ آنے ، یہ دونوں کتابیں المکتبۃ العربیۃ الکبریٰ بمبئی سے ۱۶/ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ میں آئیں ۔

(۱۵) الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ، ابن حجر عسقلانیؒ آٹھ جلدوں میں قیمت دس روپئے کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے رمضان ۱۳۵۵ھ میں آئی ، اصل قیمت بارہ روپیہ تھی ، فی روپیہ دو آنے کمیشن کے بعد ساڑھے دس روپئے ہوئی تھی مگر آٹھویں جلد کے آخری سادہ صفحات کا کونا غائب تھا اس لئے آٹھ آنے کی مزید کمی ہوگئی تھی ۔آٹھوں جلدوں کی الگ الگ جلد بندی کی تھی پھر توڑ کر دو جلدوں کی ایک جلد بنائی (۱۶) فتوح البلدان ابوالحسن بلاذریؒ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے شوال ۱۳۵۵ھ میں آئی تھی ۔(۱۷) کتاب الفہرست ابن ندیمؒ قیمت تین روپیہ، ۲۶/رجب ۱۳۵۶ھ کو ایک دوست کے ذریعہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی بمبئی سے منگائی (۱۸) شرح نخبۃ الفکر ابن حجر عسقلانیؒ قیمت ساڑھے تین آنے (زاد المعاف فی ہدی خیر العباد ابن

قیم : چار جلدوں میں قیمت چار روپیہ (۲۰) دیوان الحماسہ ابوتمام طائی مع مختصر شرح تبریزی دو جلدوں میں قیمت دو روپیہ، یہ تینوں کتابیں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے رجب ۱۳۵۶ھ میں آئیں ۔ (۲۱) الکامل فی اللغۃ والادب مبرد دو جلدوں میں قیمت ساڑھے تین روپیہ، (۲۲) فقہ اللغۃ مع سر العربیۃ ثعالبی ، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ، یہ دونوں کتابیں رمضان ۱۳۵۶ھ میں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے آئیں ۔ (۲۳) مشکوٰۃ المصابیح (اصح المطابع دہلی) قیمت دو روپیہ نو آنے ۱۷/شوال ۱۳۵۶ھ میں آئی، (۲۴) دیوان مجنوں قیمت تین آنے ، ذوالحجہ ۱۳۵۶ئھ میں آئی ۔ (۲۵) تفسیر ابن کثیر چار جلدوں میں قیمت دس روپیہ ۱۲/ربیع الاول ۱۳۵۷ھ میں آئی ، (۲۶) صحیح البخاری مع حاشیہ السندی دو جلدوں میں قیمت ایک روپیہ چودہ آنے ، ۱۵/رجب ۱۳۵۷ھ میں آئی بعد میں کئی طلبہ نے میرے ذریعہ سے منگائی (۲۷) احیاء العلوم غزالیؒ چار جلدوں میں حاشیہ پر کتاب المغنی عن الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الاخبار عراقی ، کتاب تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء عبدالقادر علوی کتاب الاملاء عن اشکالات الاحیاء غزالیؒ اورعوارف المعارف سہروردیؒ قیمت چار روپیہ ۱۶/شوال ۱۳۵۷ھ میں آئی (۲۸) تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ چار جلدوں میں قیمت ساڑھے دس روپیہ، ۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ کو آئی (۲۹) کتاب الخراج امام قاضی ابو یوسف قیمت ڈھائی روپیہ، ۲۴ ربیع الآخر ۱۳۵۸ھ کو آئی (۳۰) تفسیر جلالین مع اسباب النزول دو جلدوں میں قیمت ایک روپیہ، (۳۱) الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہؒ قیمت ڈیڑھ روپیہ ان دونوں کتابوں کی تاریخ خریداری نہیں لکھی تھی ، یہ سب کتابیں کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے آئیں (۲) سنن ابن ماجہ (۳۳) سنن نسائی (۳۴) سنن ترمذی ، یہ تینوں کتابیں پرانی تھیں ، سستے دام پر ۱۳۶۹ھ میں ایک طالب علم سے مراد آباد میں خریدیں ، یہ سب ۳۴ کتابیں ۵۸ جلدوں میں ہیں ، جن کی مجموعی قیمت اس زمانہ میں ساٹھ ستر روپیہ کے درمیان تھی جو آج کل کئی ہزار کے برابر ہے ۔ یہ کتابیں نہایت عسرت اور تنگدستی کی حالت میں کوڑی

کوڑی جمع کر کے خریدیں۔

اردو کی تعلیم ہی کے زمانے میں مجھے نادر سکہ جات اور دوسری پرانی چیزوں کو جمع کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، اس زمانہ میں قلمی اور نادر کتابوں کی تلاش وجستجو بھی رہا کرتی تھی، خاندان میں بڑے بوڑھوں سے سنتا تھا کہ ہمارے یہاں قلمی کتابیں بہت زیادہ تھیں۔ دو بورے کتابیں ایک نویں میں ڈال دی گئیں، پردادا شیخ محمد رجب کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف بہت بعد تک محفوظ تھا، مگر میری پیدائش اور ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ بھی ضائع ہو گیا، البتہ ایک قدیم مطبوعہ مجموعہ خطب ملا ہے، جس کے آخر میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا جمعہ کا خطبہ ثانیہ اور عیدین کا خطبہ موجود ہے جس کے آخر میں ۱۲۹۷ھ درج ہے، عربی رسم الخط میں نہایت پاکیزہ اور خوشخط لکھا ہے، میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ خاندان میں نیابت قضاء کے آخری دور کی چند سندیں تھیں جن کی پشت پر میں نے کاغذ چسپاں کر کے ان کو محفوظ کر لیا تھا، وہ بھی خاندان کے ناقدروں کے ہاتھوں ضائع ہو گئیں، البتہ میں نے اسی زمانہ میں ان سب کو نقل کر لیا تھا اور اپنی کتاب ''مآثر ومعارف'' میں چھاپ دیا ہے۔ صرف ایک سند محفوظ ہے۔ اسی زمانہ میں کہیں سے قصہ شاہ جمجمہ اور اللہ خدائی کے قلمی نسخے مل گئے تھے جو اب تک محفوظ ہیں۔

محلّہ کے ایک بزرگ حاجی ولی اللہ تاجر کتب بازار ایک دن قدم رسول کے چبوترہ پر اپنی دکان لگاتے تھے میں شام کو ان کی دکان پر جاتا اور کتابیں پڑھتا تھا، انھوں نے میرے شوق کو دیکھ کر ''تفسیر مرتضوی'' کا ایک نہایت نادر و نایاب قلمی نسخہ دیا، یہ شیخ غلام مرتضیٰ بن شیخ تیمور حنفی الہ آبادی متخلص بہ جنوب کی چند سورتوں کی منظوم تفسیر ہے جو ۱۱۹۸ھ میں لکھی گئی ہے۔ اردو زبان میں غالبًا پہلی تفسیر ہے جو منظوم ہے، شاید ایک آدھ نسخہ ہندوستان میں اور ہے، میں نے اس کے آخر میں یہ یادداشت لکھی ہے ''ایں نسخہ قدیمہ متبرکہ در مبارک پور یکے از تاجران کتب کہ پیر کہن سال بود، نامش

حاجی ولی اللہ بود ودر دیار عرب یک زمانہ فروکش ماندہ بود مرا بطور ہدیہ در ۱۳۵۴ھ عنایت فرمود، وبعد چند سال انتقال کرد، نزد من ایک اول منظوم تفسیر است کہ بزبان اردو مسلسل گفتہ شد۔ واللہ اعلم بالصواب۔ **وانا العبد الافقر القاضی عبدالحفیظ اطہرؔ مبارکپوری، غفرله و لمتعلقه اجمعین۔**

قصبہ کے ایک دوسرے تاجر کتب سے ایک چھوٹی سی نہایت ہی حسین وجمیل قلمی کتاب چھ آنے میں خریدی، جس میں اسماء شہداء بدر اور اسماء شہداء احد بیحد خوشنما اور جاذب نظر عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں۔ جدول اور بین السطور مطلا ہے، اس کے ایک کونے پر میں نے یہ یادداشت درج کی ہے۔ **ملکت هذاالکتاب المبارک بالبیع الشرعی یوم الخمیس ۲۹ / شوال ۱۳۵۷ھ وانا القاضی ابوالمعالی عبدالحفیظ المبارکفوری،** بخواب اندر متعلق ایں نسخہ مبارکہ مرا بشارت شدہ بود۔

جو کتابیں میرے ذوق کی ہوتیں اور ان کے حصول کی کوئی صورت نہ ہوتی ان کو نقل کر لیتا تھا، اس کے لئے بڑا اہتمام کرتا تھا، موٹے کاغذ پر دھاگے سے مسطر بناتا اچھے اچھے قلم مہیا کرتا اور پکی روشنائی تیار کرتا تھا، ہر کتاب کے آخر میں ترقیمہ میں دن، وقت تاریخ اور سنہ لکھتا تھا۔ میرے کتب خانہ میں میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) کتاب النکت فی اعجاز القرآن ابوالحسن علی بن عیسیٰ رمانی متوفی ۳۸۴ھ یہ کتاب ۳۲ صفحات کی ہے، تاریخ کتابت ۱۲/صفر ۱۳۵۴ھ ہے۔ میں نے اس کے شروع میں مقدمہ اور آخر میں مصنف کے حالات عربی زبان میں لکھے ہیں۔

(۲) **کتاب الالفاظ المترادفه**، ابوالحسن علی بن عیسیٰ رمانی، ۱۶ صفحات تاریخ کتابت ۱۴/ جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ، میں نے اس کے شروع میں عربی میں مقدمہ لکھا ہے جس میں مختلف کتابوں سے مترادف کی تعریف اور اس کے اسباب

وغیرہ لکھے ہیں۔

(۳) دیوان امرؤالقیس ،مطبوعہ شرح دیوان امرؤالقیس سے اسکے اشعار نقل کرکے آخر میں مختار الصحاح اور دوسری کتابوں سے زیادات نقل کئے ۳۳ر صفحات میں ہے، میں نے ابتداء میں پانچ صفحات میں امرأالقیس کے حالات لکھے ہیں۔ تاریخ کتابت رمضان ۱۳۵۴ھ ہے۔

(۴) **مختصر الجرجانی فی اصول الحدیث** علامہ میر سید شریف علی بن محمد بن علی جرجانی کا مختصر سا رسالہ ۱۶ر صفحات میں ہے، تاریخ کتابت بوقت عصر دوشنبہ ۱۰ر صفر ۱۳۵۵ھ

(۵) دیوان الفرزدق، بیروت کے مطبوعہ دیوان سے نقل کیا، میں نے ابتداء میں عربی میں فرزدق کا حال لکھا ہے اس کے بعد ۱۱۴ صفحات ہیں، تاریخ کتابت وقت ضحیٰ یوم جمعہ ۱۶ر جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ

(۶) انباء الاذکیاء فی حیات الانبیاء امام سیوطی کے مطبوعہ رسالہ سے نقل کیا، صفحات ۱۴ تاریخ کتابت ۷ر ربیع الاول ۱۳۵۸ھ

(۷) کتاب الدرات، اصمعی کی مختصر سی کتاب ہے، بیروت میں چند رسائل کے ساتھ چھپی تھی، آخر میں ۸۳ دارات کے نام ہیں، اس کے بعد حریری کے دو رسالہ سینیہ اور شینیہ ہیں، صفحات ۱۲ تاریخ کتابت ۲۰ر صفر ۱۳۵۵ھ

(۸) عروض وقوافی بیروت میں چھپا ہوا ایک رسالہ نقل کر کے ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحب سے تین مجلس میں پڑھا۔

(۹) الاستیعاب سے سیرت نبوی کا پورا حصہ کتابی شکل میں نقل کیا۔

(۱۰) **فقــہ اللغة** کی پہلی فصل اور دوسری کتابوں سے لغوی وادبی فوائد، عربی ادب کی تاریخ، منتخب اشعار والغاز، علماء اسلام کے قصص واحوال وغیرہ ایک کتاب نماز چھوٹی سی تقطیع کی بیاض میں مع کئے جواب تک موجود ہے۔ عربی کتابوں سے اخذ

واقتباس اور جمع وترتیب کا سلسلہ پورے دور طالب علمی میں جاری رہا اور بلا مبالغہ کئی سو صفحات سیاہ کئے۔

الغرض طالب علمی کے دور میں مطبوعات ومخطوطات کا ایک نہایت وقیع اور قابل قدر کتب خانہ جمع ہو گیا تھا جس میں مغز ہی مغز تھا چھلکے کا نام نہیں تھا۔ میں رات دن ان کتابوں میں گم رہتا تھا۔ ان کو ایک الماری میں نہایت قرینہ سے سجاتا، کیا مجال کی الماری میں کوئی آگے پیچھے یا نیچے اوپر پڑی رہے۔ جلد سازی کے وقت اہتمام کے ساتھ ابتداء میں سادے اوراق لگاتا جن پر کتاب کے مناسب فوائد ومضامین دوسری کتابوں سے نقل کرتا، کتاب کو داغ دھبہ سے بچاتا رکھنے اٹھانے میں احتیاط سے کام لیتا، میرے ساتھیوں اور دوستوں کو ان ''بیکار'' کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لئے میری ان ''قیمتی'' کتابوں کے بارے میں کسی سے بخل اور کنجوسی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اور نہ ہی کتابوں کے ضائع ہونے کا ڈر تھا، کتابوں کے ذوق وشوق کی وجہ سے بعد میں میرے پاس امہات کتب کا ایک عظیم الشان ذاتی کتب خانہ بن گیا، جس میں عربی زبان کی نادر ونایاب مطبوعات ومخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ اب اس کے رکھنے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔

مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف:۔ نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب کا ذاتی کتب خانہ بہت بڑا تھا جس میں ہر قسم کی عربی، فارسی، اردو مطبوعات ومخطوطات تین بڑی الماریوں میں نہایت قرینہ سے رہتی تھیں، چھٹیوں میں نانا مرحوم ڈھاکہ سے آتے تو رات دن کتب بینی، تصنیف وتالیف اور دواسازی میں مصروف رہا کرتے تھے، چٹائی پر کتابیں پڑی رہتی تھیں جن سے اخذ واقتباس فرمایا کرتے تھے، میں ان کے علمی انہماک کو دیکھتا تھا مگر قریب جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جب کہیں چلے جاتے تو ان کے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا اور پھر اسی طرح رکھ دیتا، بعض اوقات ان کو پتہ چل جاتا، اور پوچھتے کہ یہاں کون آیا تھا، اور میرا نام سن کر خاموش

ہوجاتے تھے۔

نانا بہ سلسلۂ مدرسی باہر رہتے تھےاور ماموں بہ سلسلہ تعلیم باہر رہتے تھے۔ان کی عدم موجودگی میں رسول پور جاتا تو کتب خانہ میں بیٹھ کر کتابیں نکالتا اور پھر اسی طرح رکھ دیتا، اکثر کتابوں پر نانا کے تعلیقات اور حواشی ہوتے تھے۔بعض کتابوں کی ابتداء میں کئی کئی صفحات ان کے ہاتھ کے لکھے رہتے تھےاور میں ان کو بہت غور سے دیکھتا تھا، حالانکہ ان کو سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں تھی، مگر یہیں سے مجھ کواخذ واقتباس کا ذوق پیدا ہوااور اردو کی تعلیم ہی کے زمانے میں اپنی استعداد کے مطابق ان کے کاموں کی نقل کرنے لگا، عربی درجہ میں جانے کے بعد ہی جب کتب بینی اور مطالعہ کا شوق بڑھا تو یہی روشنی کام آئی اور اسی دور میں مضمون نگاری اور تالیف کی طرف رجحان زیادہ ہوا۔

مدرسہ احیاء العلوم کے مدرسین وارا کین کوتصنیف وتالیف کا ذوق بالکل نہیں تھا ،ایک مرتبہ بزم احباب احمد آباد نے ائمہ اربعہ کے سوانح پر مدرسہ کے طلبہ سے مضمون طلب کیا تو بڑی مشکل سے بعض اساتذہ نے اس کو ترتیب دیا۔اس کے بعد احساس ہوا کہ طلبہ میں تحریر کا ذوق پیدا کرنا چاہئے اوراس کے لئے جمعیۃ الطلبہ کا قیام ہوا، مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ وادب کی مستند کتابیں خریدی گئیں، علمی، ادبی، اور مذہبی اخبارات ورسائل منگائے گئےاور الاحیاء کے نام سے ماہوار قلمی رسالہ جاری کیا گیا جو چند نمبروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ان کتب ورسائل سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا، خصوصاً دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، جامعہ ملیہ اور دارالتراجم کی کتابوں اور معارف، برہان، جامعہ وغیرہ رسائل سے مجھے بہت رہنمائی ملی۔ان کتابوں میں عام طور سے حوالے ہوتے تھے۔ان کو دیکھ کر عربی کے اصل ماخذوں سے براہ راست استفادہ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس زمانہ میں تاریخ وطبقات کی متعدد کتابیں اسی داعیہ پر خریدیں۔

جب لکھنے پڑھنے کی کچھ شد بد ہوگئی تو والدہ مرحومہ کی کتابوں سے خلفاء اربعہ اور ائمہ اربعہ کے مختصر حالات اس وقت کے ذوق کے مطابق ایک چھوٹی سی کاپی میں جمع کیے، اس کو تار سے سیا اوپر دبیز سرخ کاغذ کا ٹائٹل لگایا، یہ میرے تصنیفی اور تالیف ذوق کا نقش اولیں تھا۔ اردو کے دوسرے یا تیسرے درجہ میں گیا تو مشکل الفاظ کے معنی لکھنے کے لئے ایک چھوٹی سی مجلد کاپی بنائی۔ نیز اسی زمانہ میں ایک بہت چھوٹی سی کاپی میں نعتیہ اشعار جمع کیے، اس کی خوبصورت جلد بنائی، بچپن میں کتاب بنانے کا یہی ذوق آگے چل کر کتاب لکھنے کا سبب بنا۔

مضمون نگاری کی ابتداء:۔ عربی شروع کی تو شاعری کے ساتھ مضمون نگاری کا شوق ابھرا، اور اخباروں اور رسالوں میں چھپنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ سب سے پہلے میرا نام ایک پہیلی کے سلسلہ میں جامعہ ملیہ دہلی کے رسالہ ''پیام تعلیم'' میں چھپا تو مولانا شکر اللہ صاحب نے بلا کر مجھے داد دی۔ اس کے بعد اخبار الجمعیۃ دہلی میں واردھا کی خطرناک تعلیمی اسکیم کے عنوان سے ایک مختصر سا مضمون چھپا، پھر ۱۳۵۳ھ میں رسالہ ''مومن'' بدایوں میں ایک صفحہ کا مضمون مساوات کے عنوان سے شائع ہوا، کہنا چاہئے کہ میرا سب سے پہلا مضمون یہی ہے جو اس زمانہ میں شائع ہوا، پھر اسی رسالہ میں دوسرا مضمون ''رہا دین باقی نہ اسلام باقی'' کے عنوان سے دو صفحے کا چھپا، اسی زمانہ میں ہفتہ وار العدل گوجرانوالہ پنجاب میں ایک مضمون بلا کشان اسلام کے عنوان سے شائع ہوا۔ اڈیٹر نے اس کو مقالہ افتتاحیہ کی جگہ چھاپا تھا، ان مضامین کی اشاعت کے بعد مضمون نگاری کا سودا سر میں یوں سمایا کہ اس کے لئے باقاعدہ انتظام واہتمام کیا، بازار سے ایک میز ایک روپیہ دو آنہ کی اور ایک اسٹول چھ آنے کا خریدا، ایک خوبصورت بڑا سا قلمدان بنوایا، اس پر سیاہ پالش کر کے پشت پر سفید حرفوں میں بخط عربی ''**علم بالقلم**'' لکھا، سرخ اور سیاہ روشنائی بنائی، قسم قسم کے قلم خریدے، اور اسی میز پر کاغذات اور قلمدان وغیرہ نہایت سلیقہ سے رکھ کر کتب بینی، مضمون نویسی اور

شاعری کا مشغلہ جاری رکھتا تھا، مضمون نویسی کے بارے میں صرف میرا ذوق رہنما ہوا اور خود اعتمادی نے ہمت افزائی کی، معلومات کی فراہمی اور اسلوب نگارش وغیرہ میں کسی کی رہنمائی حاصل نہ ہوسکی، اس لئے ایک مضمون کئی کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا، اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا، ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابل اشاعت ہوا یا نہیں، مگر جب کسی حکّ واضافہ اور بلاتغیر وتبدل کے چھپ جاتا تو حوصلہ میں نئی جان آجاتی، اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا۔

مولانا سید محمد میاں اور رسالہ ''قائد'':۔اسی دوران ۱۳۵۷ھ میں مولانا سید محمد میاں مرحوم مدرسہ شاہی مراد آباد سے جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کیلئے تشریف لائے، مولانا نے اس زمانہ میں شاہی مدرسہ مراد آباد سے رسالہ ''قائد'' جاری کیا تھا۔ میرے دوست مولوی عثمان صاحب نے مولانا کو میرے کچھ اشعار سنائے تو مولانا نے از راہ شفقت ان کو شائع کردیا، اور مضمون لکھنے کی تاکید فرمائی اس کے بعد مولانا مرحوم مستقل طور سے قائد میں میرے مضامین اور اشعار چھاپنے لگے اور میں اس کے مستقل مضمون نگاروں میں شامل ہوگیا، بس کیا تھا؟ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں، میری دلی مراد برآئی اور مضمون نگاری کی دھن سوار ہوگئی، یکے بعد دیگرے مضامین تیار کرتا، کتابیں فراہم کرتا، مضمون میں کاٹ چھانٹ کرتا، عبارت درست کرتا اور مضمون لکھ کر پہلی فرصت میں روانہ کردیتا تھا۔ مولانا مرحوم کی نگاہ شفقت میں یہ مضامین بہت بلند پایہ ہوتے۔ اپنے خطوط میں خوب خوب ہمت افزائی فرماتے، ایک مرتبہ مجھ کو ''مولانا قاضی عبدالحفیظ صاحب اطہر مبارک پوری فاضل دیوبند'' کے خطاب سے نواز کر لکھا کہ آپ کے مضامین اعلیٰ درجہ کے اور معیاری ہوتے ہیں، زیادہ تعریف اس لئے نہیں کی جاتی ہے کہ کہیں آپ رسالہ قائد کو ان کے لئے نااہل نہ سمجھنے لگیں۔ میں نے نہایت ادب واحترام سے جواب دیا کہ طالب علم ہوں، ھدایہ وغیرہ پڑھتا ہوں۔ بعد میں جامعہ قاسمیہ میں جاکر مولانا مرحوم سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

جب تک رسالہ قائد جاری رہا، میرے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے۔ ایک مرتبہ میں نے مولانا مرحوم سے کتاب الخراج امام ابو یوسف کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی تو مولانا نے بڑی محبت وشفقت کا اظہار فرماتے ہوئے کتاب عطا فرمائی، میں نے اس کے اوپر عمدہ کاغذ لگا کر کتاب اور مصنف کا نام خوشخط اور جلی حروف میں لکھا، جب کتاب واپس کی تو مولانا نے ہاتھ میں لیتے ہیں فرمایا کہ میں نے سمجھا کہ آپ نے یہ کتاب لکھی ہے، میں نے عرض کیا کہ حضرت! دعا فرمائیں۔ اور جب میری کتاب رجال السند والہند چھپی اور میں نے مولانا مرحوم کی خدمت میں بھیجی تو طالب علمی کے اس واقعے کی طرف اشارہ کر کے لکھا کہ یہ آپ کی دعا اور توجہ کی برکت ہے کہ میں اس لائق ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم اس سلسلے میں میرے اولین محسن اور مربی ہیں اگر ان کی توجہ نہ ہوتی اور رسالہ قائد میں مضامین شائع نہ ہوتے تو شاید میں تصنیف و تالیف کے لائق نہ ہوتا اور میری جولانئ طبع نامساعد حالات کی نذر ہوگئی ہوتی۔

مضامین واشعار کے شائع ہونے کے بعد شاعری اور مضمون نگاری کے ساتھ تصنیف و تالیف اور تلاش و تحقیق کا ذوق جرأت و ہمت دکھانے لگا، چنانچہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں پانچ کتابیں لکھیں، دو عربی میں اور تین اردو میں۔

(۱) سب سے پہلے شوال ۱۳۵۵ھ میں حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ کے مشہور اور متبرک قصیدہ **بانت سعاد** کی شرح عربی میں لکھی اور اس کا نام **خیر الزاد فی شرح بانت سعاد** رکھا جو بڑے سائز کے بیس صفحات میں ہے،۔ ابتداء میں تین صفحے کا عربی میں مقدمہ ہے جس میں حضرت کعب بن زہیرؓ کے حالات، قصیدہ کا واقعہ اور اس کے اشعار کی تقطیع وغیرہ ہے، یہ کتاب اب تک میرے پاس ہے اور میں اس کو اپنی تصنیفی کوشش کا نقش اولیں سمجھتا ہوں۔

(۲) وفیات الاعیان، تذکرۃ الحفاظ، فہرست ابن ندیم سے علماء سلف اور ائمہ علم وفن کے واقعات مختلف عنوانات پر جمع کر کے عربی میں ایک کتاب ''**مرآۃ العلم**''

کے نام سے مرتب کی جو متوسط سائز کے ۵۴ صفحات کی ہے۔ آخر کے ۶ صفحات میں علم وعلماء سے متعلق اشعار ہیں، یہ کتاب بھی میرے پاس موجود ہے۔

(۳) ائمہ اربعہ کے عنوان سے میں رسالہ ''قائد'' میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا اور وفیات الاعیان، تذکرۃ الحفاظ، تہذیب التہذیب، فہرست ابن ندیم وغیرہ سے اسی وقت کے معیار کے مطابق تحقیقی کام کی ابتداء کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تہذیب التہذیب جلد دہم مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری مرحوم کے کتب خانہ سے لے کر اس سے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ امام مالکؒ پر بعض وجوہ سے ختم ہوگیا، کچھ دنوں کے بعد اس کو کتابی شکل میں مرتب کیا جس میں ائمہ اربعہ کے مختصر حالات تھے، قیام لاہور کے زمانہ میں مرکز تنظیم اہل سنت نے شائع کرنے کیلئے کتابت کرائی، اسی دوران ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، میں وطن میں تھا کاپی تصحیح کے لئے آئی۔ میں نے تصحیح کر کے روانہ کردی اس کے بعد پتہ نہ چلا، اس کا مثنیٰ میرے پاس تھا۔ ۱۳۶۸ھ میں بمبئی گیا تو سلطان کمپنی بھنڈی بازار نے شائع کرنے کا وعدہ کیا، میں نے دوسرا مسودہ دے دیا، مگر چند دنوں کے بعد اس کا مالک مشرقی پاکستان چلا گیا اور آج تک اس کا پتہ نہ چلا۔ تقریباً سوا سو صفحات کی مختصر ہونے کے باوجود بہت جامع تھی۔

(۴) الاستیعاب، الاصابہ اور اسدالغابہ وغیرہ سے حضرات صحابیات رضی اللہ عنہن کے دل آویز اور سبق آموز واقعات الگ عنوان سے جمع کئے اور ''الصالحات'' کے نام سے کتاب مرتب کی، اور قیام لاہور کے زمانہ میں ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کو چھاپنے کے لئے دی اس کا کتاب کا بھی پتہ نہ چلا اور نہ ہی میرے پاس اس کا مسودہ ہے۔

(۵) ان ہی ایام میں اصحاب صفہ کے نام سے ایک منظوم کتاب لکھی جس میں تقریباً سوا دو سو اشعار تھے، انداز نہایت والہانہ اور عقیدت مندانہ تھا اس میں حضرات اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کیا سماء واحوال شاہنامہ اسلام کے طرز پر جمع کئے تھے، مولانا

سید فخر الدین احمد صاحب نے اسے دیکھ کر بہت پسند فرمایا اور دو ایک جگہ اصلاح دی تھی اور مولانا سید محمد میاں صاحب نے اسے مزید تصحیح کے لئے مولانا اعزاز علی صاحب کے پاس بھیج دیا، اور ان سے اصلاح کے بعد آ گئی۔ وطن واپس آیا تو تو اسی سال (۱۳۵۹ھ) شباب کمپنی بمبئی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول السورتی) کے لئے بعض کتابوں کا ترجمہ کیا اور رسالہ ''اصحاب صفہ'' اسی کمپنی کو دیا، مگر اس کی بھی اشاعت نہ ہوسکی، میرے پاس کی نقل بھی نہیں ہے، اسکا مجھے بے حد افسوس ہے خاصے کی چیز تھی۔

مضمون نگاری، شاعری کے ابتدائی نمونے:۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں قلم پکڑنے اور کچھ نہ کچھ لکھنے کا شعور اردو تعلیم کے زمانہ ہی سے پیدا ہوگیا تھا، عربی شروع کی تو اس کا شوق زیادہ ہوگیا اسی زمانہ میں رسالہ ''مومن'' بدایوں کے اڈیٹر مولوی محمود الحسن صاحب توسیع اشاعت کے لئے مبارک پور آئے، میں ان سے ملتا رہا، انہوں نے میرے شوق کو دیکھ کر کہا کہ تم مضمون لکھو میں شائع کروں گا، ان کی شہ پا کر میں نے دو مضمون جلدی میں لکھ کر ان کو بھیج دیئے۔ ایک کا عنوان ''مساوات'' تھا جو ۱۳۵۳ھ دسمبر ۱۹۳۴ء کے رسالہ مومن میں چھپا، یہ ''جناب مولوی عبدالحفیظ صاحب اعظمی متعلم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور'' کا پہلا مضمون تھا، ملاحظہ ہو:

> بنی نوع انسان میں مساوات و یکسانیت کا حد اعتدال پر قائم رکھنا اتنا ضروری اور لازمی امر ہے کہ جس کے بغیر نہ کسی سلطنت کا نظام اچھی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ دنیا کی کوئی جماعت فروغ پاسکتی ہے، جو مذہب یا قانون مساوات و یکسانیت سے خالی ہے سمجھ لو کہ وہ بالکل ناقص ہے، اسی طرح جو جماعت یا سوسائٹی اپنے افراد میں مساوات و یکسانیت بدرجہ اتم قائم و برقرار نہ رکھ سکتی ہو یقین کرلو کہ وہ آج نہیں تو کل دنیا سے فنا ہوجائے گی۔ اس طرح ہر نظام اور ہر سوسائٹی کی روح رواں حقیقت میں مساوات اور صرف مساوات ہے،

آج کل دنیا کی کوئی قوم اور مذہب ایسا نہیں جو مساوات کا دعویدار نہ بنتا ہو۔لیکن جب ایک انصاف پسند انسان صحیح طریقے پر اس کی جانچ کرنے بیٹھتا ہے تو اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب اس امتحان میں پورا نہیں اترتا۔اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلام نے اس دور میں دنیا کے اندر مساوات کی بنیاد ڈالی جب کہ سارے عالم پر خودنمائی اور خود پسندی کا بھوت سوار تھا۔کہا جاتا ہے اسلام دنیا سے بت پرستی مٹانے آیا تھا بیشک اس نے ظاہری بتوں کی پرستش کو بھی دنیا سے مٹایا اور غرور و پندار کے بتوں کو بھی سارے جہاں سے نیست و نابود کیا،عرب جہاں پتھر کے خودتراشیدہ بتوں کی پرستش میں مبتلا تھا وہاں اس میں خودساختہ خاندانی بت اور نسلی شرافت کی دیویاں بھی بکثرت پوجی جاتی تھیں۔اور اکثر غریب اور کمزور جماعتوں کے حقوق نہایت بے دردی کے ساتھ پامال کردیئے جاتے تھے۔اسلام نے آکر اہل عرب سے اس لعنت کو دور کیا،غریبوں کو نوازا اور غلاموں کی دلجوئی کی،جس کی برکت سے اہل عرب میں ایک اجتماعی طاقت پیدا ہوئی اور پھر دیکھتے دیکھتے آن واحد میں سارے جہان پر چھا گئے اور تھوڑی ہی مدت میں اسلام ایک عالمگیر مذہب بن گیا۔فروغ اسلام کے متعلق یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔لیکن آپ ذرا غور سے کام لیں تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے اس قابل رشک فروغ میں صرف ایک باہمی مساوات و یکسانیت کا راز پنہاں تھا جس کو اسلام نے کبھی اور کسی حالت میں نظر انداز کردینا روا نہ سمجھا اور اب تک بھی تمام اسلامی کتابیں اس یکسانیت ومساوات کی پاک تعلیم سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں اور قانون اسلام کی ساری

دفعات واحکامات میں اس وقت تک پوری پوری مساوات و یکسانیت موجود ہے ۔ چنانچہ آپ کو ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ملے گا جس میں پوری پوری مساوات نہ پائی جاتی ہو۔

اردو تعلیم ہی کے زمانے سے شعروشاعری کا ذوق ابھرنے لگا تھا، اس وقت میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی، مضمون نگاری کی طرح شعروشاعری میں بھی کسی سے اصلاح یا مشورہ کی باری نہیں آئی اور اپنے ذوق ہی کو رہنما پایا، خوداعتمادی کے ساتھ آگے بڑھا تو اس میں بھی بہت زیادہ انہماک ہوگیا، درسی کتابوں کے ساتھ غیر درسی کتابوں کا مطالعہ، مضمون اور شعروشاعری یہ تمام مشاغل بیک وقت جاری تھے، گھر کے روزمرہ کے کام کاج مزید برآں تھے۔ آئے دن جلسوں کے لئے ملی، قومی، سیاسی اور مذہبی نظمیں کہنے لگا۔ ان ہی ایام میں جامع مسجد کی تعمیر کا اجتماعی انداز میں چندہ ہونے لگا اور لوگوں میں بے انتہا جوش تھا۔ اس کے لئے ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ نظمیں کہتا تھا اس وقت میری شاعری جنون کی حد تک پہونچ گئی، اشعار ابلتے تھے۔ بعض اوقات چاروں طرف سے مجمع مجھے گھیر کر کہتا کہ ابھی ایک نظم کہو فلاں صاحب کے یہاں چندہ میں پڑھنی ہے اور میں اسی حالت میں اشعار کہتا جو فوراً پڑھے جاتے تھے اور روپیہ برسنے لگتا تھا۔ مولانا شکراللہ صاحبؒ بھرے مجمع میں خوب خوب تشجیع فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک حکیم صاحب کی دوکان پر بھیجا انہوں نے مجھے کوئی مقوی دماغ معجون دیا، میں اس کو مولانا کے پاس لایا تو کہا کہ تم اس کو صبح وشام استعمال کرو اس سے دماغی قوت بڑھے گی، میں نے عرض کیا مجھے کسی قسم کی دماغی کمزوری نہیں محسوس ہورہی ہے یہ کہہ کر فوراً واپس کردیا۔ اسی زمانہ میں میری بعض غزلیں اور نظمیں چھپی تھیں۔ رسالہ الفرقان بریلی جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ میں ''مسلم کی دعا'' کے عنوان سے میری پہلی نظم شائع ہوئی تھی۔

جامع مسجد کے چندہ کے سلسلہ میں بہت سی نظمیں کہی تھیں، ان سب کو ''اذان

کعبہ'' کے نام سے جمع کرلیا ہے۔ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

نظر جب اٹھائی جا رہی ہے
جھلک کعبہ کی پائی جا رہی ہے

نظر میں نور پیدا ہو رہا ہے — یہ دل شاد تمنا ہو رہا ہے
زمیں پر عام چرچا ہو رہا ہے — فلک پر شور برپا ہو رہا ہے
کوئی مسجد بنائی جا رہی ہے

بناؤ جامع مسجد بناؤ — بڑھاؤ دین کی شوکت بڑھاؤ
کماؤ دولت عقبیٰ کماؤ — بلاؤ روح حاتم کو بلاؤ
یہاں ہمت دکھائی جا رہی ہے

مسلماں! سن ذرا گوش صفا سے — مسلماں ! کام لے جود وسخا سے
مسلماں! جوڑ رشتہ مصطفیٰ سے — مسلماں! تیری مذہب سے خدا سے
محبت آزمائی جا رہی ہے

تعالی اللہ یہ پر نور مسجد — حقیقت میں ہے رشک حور مسجد
ہے نگہ خاص کی منظور مسجد — سدا اطہر! رہے معمور مسجد
بہت بہتر بنائی جا رہی ہے

ابن رشیق نے کتاب العمدہ میں ''**باب من رفعه الشعر و من وضعه**'' کے تحت کئی ایسے شعراء کا حال لکھا ہے جو اپنی شاعری کی وجہ سے ابھرے اور کئی شعراء گمنام ہو گئے، میری خودروشاعری نے مجھے آگے بڑھانے میں بہت مدد کی، لاہور کے اخبار ''زمزم'' اور اخبار ''مسلمان'' (بعد میں کوثر) میں میرے اشعار کثرت سے چھپتے تھے جس سے میں بحیثیت شاعر مشہور ومتعارف ہوا، اور یہی تعارف مرکز اہل سنت امرتسر اور اخبار زمزم لاہور جانے کا سبب بنا اور یہی بمبئی جانے کا سبب بنا، اس طرح میری شاعری نے مجھے بہت فائدہ دیا مگر اب اس سے میرا تعلق نہیں رہا۔معلوم نہیں

میں نے اس سے بے وفائی کی یا اس نے مجھے اچھی راہ پر لگا کر خود کنارہ کشی کر لی۔

زمانہ طالب علمی میں شعر و شاعری عموماً مفید ثابت نہیں ہوتی ہے لیکن اگر سلیقہ اور اعتدال سے ہو تو بہت خوب اور مفید ہے اس سے ذہنی اور فکری جلا پیدا ہوتی ہے۔

عربی ادب کی تعلیم:۔ میں نے دیسی یعنی قدیم طریقہ تعلیم کے ایک مدرسہ میں چار قصباتی اساتذہ سے عربی کی تعلیم حاصل کی جس میں ادب اور عربیت بھی شامل ہے۔ عام طور سے ایسے مدارس میں عربی شعر و ادب کی قدیم کتابیں قدیم طرز پر پڑھائی جاتی ہیں کیونکہ کتاب وسنت کی زبان یہی قدیم عربی ہے اور مدرسوں کا مقصد کتاب وسنت کی تعلیم براہ راست عربی زبان میں ہے اسی طرز تعلیم سے ہندوستان میں عربی کے عظیم مصنف پیدا ہوئے ہیں اور ان کی تصانیف حواشی اور شروح زبان وادب کے اعتبار سے معیاری تسلیم کی جاتی ہیں۔

میرا عربی کا ذوق مقامات حریری، دیوان حماسہ، دیوان متنبّی، سبعہ معلقہ کے درس اور لغت وادب کی کتابوں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ۱۳۵۵ھ میں قصیدہ بانت سعاد کی عربی شرح لکھی تو اس کا مقدمہ کچھ اس طرح لکھا:

الحمد لله الذی اسبغ علینا من النعم و جعل فی لسان العرب من اللطائف والحکم والصلاۃ والسلام علی حبیبہٖ نبینا المکرم المبعوث الی کافۃ الامم و علیٰ آله و اصحابه الذین هم مصابیح الظلم ، صلی الله علیه و آلهٖ و صحبهٖ وسلم . أما بعدً فیقول العبد الاحقر القاضی عبدالحفیظ محمد اطهر مبارکفوری انی اردت ان اشرح قصیدۃ بانت سعاد الذی طارت شهرته فی اطراف العالم والابعاد لکعب بن زهیر بن ابی سلمیٰ رضی الله عنه و وفقنی الله فی منتصف شوال المکرم سنة خمس وخمسین و ثلثمائة بعد الالف فشرحته کیف ما قدرت طاویا کشح القیل والقال لئلا یوجب الملال

والاختصار لئلا یکون سبباً للکلال و سمیته خیر الزاد فی شرح بانت سعاد" و ھذا اول جولان یراعی فی میدان القرطاس وانا غمر جاھل من مثل ھذاالشان فانہ ما اغبر مذ نیطت عن التمائم و نیطت بی العمائم الا برھة من الزمان وانا معترف بعجز و التمس من السادۃ الکرام ، ان یصفحوا عن زلاتی واعرضوا من ان یاخذونی عرضة للملامة والمسئول من الله تعالیٰ ان یجعله خالصاً لوجهه الکریم و منه التوفیق والعصمة ومنه الاستعانة فی کل امر .

طبعی رجحانات:۔ طالب علمی کا تقریباً پورا دور عسرت اور تنگی میں گذرا ،کھانے پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی اس وقت آج کل کی طرح معاش ومعیشت کی فروانی وفراخی نہیں تھی ۔ عام طور سے لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے،اس لئے تنگ دستی اور غربت کا احساس نہیں تھا بلکہ سب لوگ اسی زندگی پر راضی وخوش رہا کرتے تھے۔اس میں بڑی خیر وبرکت تھی۔میں بھی ہر معاملہ میں اپنے ذوق وشوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھااور کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔

سفید گزی گاڑھے کا کرتا پائجامہ عام لباس تھا،شیروانی بہت کم پہنتا تھا اوپر صدری ہوا کرتی تھی ،ٹوپی کشتی نما اچھے کپڑے کی ہوتی تھی جوتا اس زمانہ کے لحاظ سے قیمتی ہوتا تھا،عطر کی شیشی ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا،کپڑے خود ہی دھولیا کرتا تھا،یہی وضع قطع آج بھی باقی ہے،مگراب احساس ہوتا ہے کہ اتنی سادگی بھی اچھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مضر،موہم بخل اور باعث تحقیر ہوجاتی ہے۔

مدرسہ کے طلبہ جو اکثر قصبہ اوراطراف کی بستیوں کے ہوا کرتے تھے عصر کے بعد عیدگاہ پر جمع ہوتے تھے، یہ بہت پرفضا جگہ ہے،شمال میں سامنے سمودی کا وسیع و عریض تالاب،عیدگاہ کے پیچھے کچے صحن میں نیم کے درختوں کی قطار،جنوب میں تاحد نظر میدان ،اورآس پاس سرسبزی وشادابی عجیب جاذب نظراور دلکش منظر پیدا کرتی

تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حافظ شیرازی کا ’’کنار آب رکنا باد، وگل گشت مصلیٰ‘‘ یہیں پر آ گیا ہے۔اسی زمانہ میں ’’برسات کی چاندنی رات‘‘ کے عنوان سے میں نے ایک نظم کہی تھی جس میں یہ شعر بھی تھا۔

دور کچھ یاں سے سمودی کے کنارے آم پر
اک پپیہا دے رہا تھا جاں پیا کے نام پر

میں بڑے اہتمام اور نہایت ذوق وشوق سے یہاں کی تفریح میں شریک رہا کرتا تھا۔ اس زمانہ میں یہی تفریح تھی۔

عشاء کے بعد درسی کتابوں کے مطالعہ میں لگ جاتا تھا جو عام طور سے تین چار ہوتی تھیں اور کل دن کے اسباق کو رات میں حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔اس کے بعد غیر درسی کتابوں کے مطالعہ، مضمون نگاری، اور شاعری میں لگ جاتا تھا۔اس سے فراغت کے بعد چار پائی پر جاتا تو تو کوئی غیر درسی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی یا شعروشاعری کا مشغلہ رہتا تھا۔

علمی وتعلیمی نشاط کے ساتھ بلند حوصلگی، عالی ہمتی اور خودسازی کا احساس ہر معاملہ میں نقطۂ عروج پر رہتا تھا۔ بڑوں اور بزرگوں کا واجبی احترام مدنظر رہتا تھا مگر بیجا عقیدت نہیں تھی، بعض اوقات قصبہ کے بڑوں کے یہاں طلبہ ومدرسین کی دعوت ہوا کرتی تھی، میں کسی بہانے سے بچ کر ان کے لقمۂ تر کے مقابلہ میں اپنی نان جویں میں زیادہ لذت پاتا تھا۔

مرادآباد گیا تو ابتداء میں ایک گھر سے کھانا لانا پڑتا تھا۔ایک آدھ ہفتہ ضمیر پر جبر کر کے چھپتے چھپاتے یہ کام کیا، پھر ڈھائی روپیہ ماہوار مدرسہ سے وظیفہ لے کر اس سے نجات حاصل کر لی اور ایک معمولی ہوٹل میں چھ پیسہ فی وقت کے حساب سے کھانا کھانے لگا، قیام مرادآباد کی مدت میں پچاس ساٹھ روپیہ گھر کے خرچ ہوئے۔میری پوری تعلیم پر بہت ہی کم خرچہ ہوا ہے۔

آگے چل کر کفایت شعاری، سادگی، خودشناسی اور کم آمیزی نے بہت فائدہ دیا ،اسی کی برکت ہے کہ بمبئی جیسے شہر میں مدت دراز تک رہنے کے باوجود میں بمبئی والا بالکل نہیں بن سکا، بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا، تملق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسہ کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا وہ اس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہوسکا، اور الحمد للہ کہ میں نے اس شہر کے ایک معمولی کمرہ میں بیٹھ کر وہ کام کیا جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی وتالیفی اداروں میں کیا جاتا ہے اور اس سے دولت کمائی جاتی ہے۔

میں نے اپنی کسی کتاب پر نہ کسی قسم کا معاوضہ لیا، نہ رائلٹی کی بات کی، اور نہ اس کے لئے کوئی تحریر لکھی، بلکہ علم کی خدمت واشاعت کے جذبہ سے لکھی اور اسی جذبہ سے ناشروں کو ان کی طباعت واشاعت کی اجازت دی۔

قیام مرادآباد کے دوران پہلی مرتبہ دہلی گیا تو ندوۃ المصنفین میں جانا ہوا اور اس کے ناظم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم سے ملاقات ہوئی، میرے دوست مولانا محمد عثمان صاحب ساتھ تھے، اس بار بھی انہوں نے مبالغہ آمیز انداز میں میرا تعارف کرایا، مفتی صاحب نے اس وقت مجھ سے فرمایا کہ ''برہان'' کے لئے مضامین لکھا کریں، معاً خیال ہوا کہ ندوۃ المصنفین اور اس کے ترجمان ''برہان'' کے معیار پر مضامین کہاں پورے اتر سکتے ہیں؟ مگر اللہ کی شان کہ بعد میں اس ادارہ سے مفتی صاحب مرحوم نے میری آٹھ کتابیں اعلیٰ معیار پر شائع کیں اور اب رسالہ برہان کے اعزازی ادارت کی باری آگئی ہے۔

ایام طالب علمی میں حدیدی حروف کی مصری کتابوں سے بیحد شغف تھا، خوب خریدتا تھا اور خوب پڑھتا تھا، سوچتا تھا کہ کیا کبھی میری بھی کوئی کتاب اس طرح چھپ سکتی ہے؟ پھر خیال ہوتا تھا کہ مجھ جیسے بے سہارا اور بے نوا کے لئے یہ خیال خام اضغاث احلام ہے، مگر یہ تمنا بھی پوری ہوئی اور اب تک میری تین کتابیں بمبئی میں اور

تین کتابیں قاہرہ میں ان ہی حروف میں چھپ چکی ہیں اور اردو کی دو کتابوں کے عربی ترجمے قاہرہ اور ریاض سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔

بچپن میں سنن ونوافل کا بہت اہتمام کرتا تھا، اکثر خواب سچے ہوا کرتے تھے، لوگوں کی صورت دیکھ کر نام بتانے کا شوق تھا اور نوے فیصدی صحیح ہوتا تھا۔ دعا تعویذ سے شغل کبھی نہیں رکھا، مگر اسی زمانہ میں اعمال قرآنی، تعویذ سلیمانی، نقش سلیمانی، حرز سلیمانی وغیرہ خرید کر پڑھتا تھا، قوت خیالیہ کے کرشمے دکھائی دیتے تھے، اگر اسی راہ پر لگ جاتا تو زہد وتصوف کا رنگ غالب ہوتا، یہی وجہ ہے کہ احسان وتصوف کا ذوق فکری حد تک اب بھی ہے گو عملی طور سے اس سے دور ہوں، حقیقی تصوف اور صوفیہ سے عقیدت ومحبت ہے اور بزرگان دین اور مشائخ عظام کے تذکرے میں بڑا لطف و سکون پاتا ہوں۔

شعر وشاعری کا ذوق ابھرا تو اتنا غلو ہوا کہ خواب میں اشعار کہنے لگا، اگر یہ صورت باقی رہتی تو اچھا خاصا شاعر بن گیا ہوتا۔ تعلیم وتدریس کا سلسلہ زمانۂ طالب علمی سے جاری تھا اور اسی میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ تھا، مدرسوں کی فضا صاف ہوتو یہ زندگی بڑی پرسکون اور خیر وبرکت کی ہے، اگر مدرسہ والے مجھے قبول کر لیتے تو میں بہترین مدرس ہو گیا ہوتا، اس کے باوجود ہر حال میں کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری رکھا۔ ان سب رجحانات پر علمی وتحقیقی ذوق یوں غالب رہا کہ ابتدائی چند سالہ مدرسی کے بعد تقریباً پورا دور صحافت اور اخبار نویسی جیسی سطحی مشغولیت میں گذرا مگر میں نے صحافی اور اخبار نویس بننا گوارا نہیں کیا بلکہ اس کو صرف ذریعہ معاش بنا کر اور اپنے کو علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں مشغول رکھ کر ''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ'' کے مانند کام کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کاروانِ حیات (غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح)

ازفراغت تعلیم تا قیام بمبئی

فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش:۔فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو دہلی لکھا کہ آپ قرآن کی تعلیم وتفہیم کا ادارہ جاری کرنے والے ہیں، میں بھی اس میں داخلہ کا امیدوار ہوں، مولانا نے جواب دیا کہ قوم کی بے توجہی سے اب تک اس کا انتظام نہیں ہوسکا ہے، اگرادارہ جاری ہوا تو آپ کا خیال رکھا جائے گا، بات آئی گئی ہوئی، مولانا شکراللہ صاحب کے مشورہ سے مولانا محمد منظور نعمانی کو لکھا کہ ''دفتر الفرقان'' میں جگہ ہوتو مجھے رکھ لیں، انھوں نے ٹیلیگرام کے ذریعہ لکھنؤ بلایا، اور جب گیا تو کہا کہ ندوۃ العلماء میں ہر جمعرات کو اجتماع ہوتا ہے، آپ اس میں میری تقریر نوٹ کریں، بیس روپیہ ماہوار ملے گا، یہ سوچ کر کہ ''لکھنؤ میں رہیں گے پر کھائیں گے کیا''، مایوسی کے بعد دفتر جمعیۃ علماء صوبہ یوپی میں گیا اور کہا کہ جمعیۃ علماء میں نشر واشاعت کا شعبہ ہے، اس میں گنجائش ہوتو مجھے موقع دیں۔ مولانا بشیر احمد بھٹہ صدر تھے، انھوں نے کہا کہ فی الحال یہ شعبہ جاری نہیں ہے، پھر انھوں نے جمعیۃ علماء اور میرے مفاد میں کہا کہ آپ جمعیۃ کے لئے سفارت قبول کرلیں، چندہ کی رقم سے آپ کی تنخواہ اور جمعیۃ علماء کی آمدنی دونوں کا کام چلے گا، اس پیشکش کو بھی قبول نہ کرسکا، لکھنؤ سے ناکام واپس آیا، البتہ نخاس سے ڈریپر کی کتاب ''معرکۂ سائنس و مذہب'' مترجمہ مولانا ظفر علی خاں غالباً تین روپیہ میں خریدی، مکتبہ الفرقان سے **نزھة الخواطر** جلد اول خریدی، یہ سفر میں نے دس روپیہ قرض لیکر کیا تھا، اس وقت ریل کا کرایہ دوروپیہ ۱۴؍آنے تھا، اس درمیان میں برما کے جیل افسر آئے، انکو ایک دینی عالم کی ضرورت تھی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے

مشورہ سے طے پایا کہ میں برما جاؤں، ہر دو سال کے بعد واپسی ہوگی۔ تنخواہ وغیرہ گورنمنٹ دے گی، میں نے ان کی ایک دن دعوت بھی کی تھی، مگر واپسی کے بعد وہاں سے کوئی خط نہیں آیا۔

احیاء العلوم کی مدرسی:۔ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو مولانا شکر اللہ صاحبؒ نے مدرسہ کے چندہ کے لئے بستی بھیجا، اور میں وہاں کے ایک طالب علم محمد تقی مرحوم کے گاؤں گیا۔ واپسی پر مولانا نے کہا کہ مدرسہ احیاء العلوم میں تم ایک سال حسبۃً للہ پڑھاؤ تو تم کو استحقاق ہو جائے گا، اور عربی درجہ میں لے لئے جاؤ گے، مرتا کیا نہ کرتا، والد صاحب سے مشورہ کے بعد مجبوراً حسبۃً للہ مدرس بن گیا، شوال ۱۳۵۹ھ میں۔ ظاہر ہے کہ استحقاق کی خاطر حسبۃً للہ پڑھانا دوسرے امیدواروں کے حق میں مضر تھا، اس لئے حسبۃً للہ کا جملہ مذاق اور طعن و تشنیع کے طور پر استعمال ہونے لگا، کسی طرح سال پورا ہونے کے بعد شوال ۱۳۶۰ھ میں با تنخواہ مدرسی کی باری آئی، تو مولانا نے بارہ روپیہ میری تنخواہ تجویز کی، میں نے عاجزانہ جرأت کر کے انکار کر دیا، اور کہا کہ یہ جگہ ۱۵/ روپیہ کی ہے، چنانچہ یہی رہی، اور ان کے وصال سے پہلے یا بعد میں تین روپیہ کا اضافہ ہوا، اور اٹھارہ روپیہ تنخواہ ہوگئی۔

مولانا شکر اللہ صاحب کا حسن انتظام:۔ آج کی طرح اس زمانہ میں مدرسوں میں روپیوں کی فراوانی اور بہتات نہیں تھی، مہینہ ختم ہونے پر ناظم کو مدرسین کی تنخواہ کا انتظام کرنا پڑتا تھا، اور بعض اوقات بڑی مشکل پیش آتی تھی، مدرسہ احیاء العلوم میں سب سے اونچے مدرس کی تنخواہ بیس روپیہ تھی، اس حساب سے بارہ یا پندرہ روپیہ بالکل مناسب تھی، پھر مولانا مرحوم مدرسہ کے انتظامی امور میں بے حد محتاط تھے، کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی بے جا خرچ ہو، پائی پائی کا حساب رکھتے تھے، البتہ مدرسہ کے لئے زمین اور عمارت کے بارے میں دور اندیشی سے کام لے کر روپیہ خرچ کرنے میں فراخ دل تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ جمعیۃ

الطلبہ کے جلسہ کی صدارت کے لئے تشریف لائے تو اہتمام کی بلند و بالا شاندار عمارت دیکھ کر فرمایا کہ ''جب مدرسہ کی عمارت اتنی شاندار ہوگی تو مدرسین کی تنخواہ کم ہوگی ہی۔''

مولانا شکر اللہ صاحب کی وفات:۔ شوال ۱۳۵۹ھ سے محرم ۱۳۶۴ھ تک ساڑھے چار سال تک احیاء العلوم میں مدرسی کی، اسی دوران مولانا شکر اللہ صاحب نے کئی ماہ کی بیماری کے بعد دوشنبہ ۵/ربیع الاول ۱۳۶۱ھ کو وصال فرمایا، اس وقت جماعت اور مدرسہ میں انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی، جس میں شدت آتی گئی۔

زیر تدریس کتابیں:۔ میں نے احیاء العلوم کی مدرسی کے زمانہ میں یہ کتابیں پڑھائیں ہیں، علم الصیغہ، نور الایضاح، قدوری، شرح نقایہ کبریٰ، ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، مقامات حریری، سبعہ معلقہ، مقدمہ ابن خلدون، (علوم کے متعلق حصہ) اور دیگر متوسطات۔ ہدیہ سعیدیہ اور مقامات ہر سال میرے ذمہ ہوتی تھی۔ اور میں ان دونوں کے پڑھانے میں ممتاز تھا، کئی طلبہ مقامات کی کاپی لکھتے تھے، بعض کے پاس اب تک محفوظ ہے، طلبہ اور استاذ کی عمر میں دو چار سال کا فرق تھا، اس لئے سب میں ذہنی ہم آہنگی تھی پڑھنے والوں اور پڑھانے والے دونوں میں نشاط رہتا تھا، چھوٹے بڑے بھائی معلوم ہوتے تھے، ان میں کئی وہ طلبہ بھی تھے جن کو میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی پڑھاتا تھا، اس زمانہ میں قصبہ کے اطراف وجوانب کے طلبہ زیادہ ہوتے تھے، احیاء العلوم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، اس لئے طلبہ اور اساتذہ میں بڑی ہم آہنگی اور مناسبت رہتی تھی، گویا عزیزانہ تعلقات ہوتے تھے، اس لئے پڑھنے پڑھانے میں بڑا نشاط تھا، اس کے ساتھ ادب احترام میں فرق نہیں آتا تھا۔

بعض اوقات اثنائے درس میں کسی جگہ رک جاتا تو فوراً مولانا مفتی یٰسین صاحبؒ کے پاس جا کر عبارت کا مطلب معلوم کرتا تھا، وہ کہتے تھے کہ درس سے پہلے آ کر پوچھ لیا کرو اس سے طلبہ پر برا اثر پڑے گا۔ میں عرض کرتا کہ میری طرح وہ بھی علمی معاملہ میں فراغت کے بعد اپنے اساتذہ سے استفادہ میں جھجھک نہیں محسوس کریں

گے، میں نے یہ بات مفتی صاحب سے ہی سیکھی تھی، زمانۂ طالب علمی میں وہ ہم لوگوں کو پڑھاتے وقت کہیں اٹک جاتے تو فوراً لغت وغیرہ اٹھا کر دیکھتے تھے، اور ہم لوگوں سے بھی کہتے تھے کہ فلاں کتاب میں دیکھو کہ کیا لکھا ہے؟ جب ہمارے استاذ اثنائے درس ہمارے سامنے رک جاتے اور مشکل حل کرنے میں ہم سے بھی تعاون یا استفادہ کے خواہشمند تھے، تو ہم اپنے شاگردوں کے سامنے انکو سکھانے کیلئے ایسا کیوں نہ کریں۔

معاشی اور خانگی دشواریاں:۔مدرسی کا یہ دور معاشی اور خانگی حالات کے اعتبار سے میرے لئے بڑا صبر آزما اور کٹھن گزرا ہے، مگر ذہنی اور فکری اعتبار سے بڑا پُر بہار رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس قدر پریشان خاطری بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر ہمت وحوصلہ میں توانائی آتی جاتی ہے، میں کوئی فن اور ہنر نہین جانتا تھا، مدرسی کے علاوہ کیا کرسکتا تھا؟ پھر بچپن ہی سے پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا، اور اسی میں مزاج بنا تھا، اس لئے مدرسی میں خوب جی لگتا تھا، اور جم کر پڑھاتا تھا، اور آج بھی مدرسہ ہی کا مزاج ہے۔اگر مولانا شکراللہ صاحب اس طور سے میری دستگیری نہیں کرتے تو میں بہر حال مجبوراً کسی کام میں لگ جاتا اور سب کچھ کیا کرایا خاک میں مل جاتا، جیسا کہ اس موقع پر بہت سے اہل علم جوان ضائع ہوجاتے ہیں، مدرسوں میں ہنر سکھانے کا خیال وعمل غلط نہیں ہے، عام حالات میں مفید ہے، مگر فراغت کے بعد ہنر مند مولوی جب معاشی پریشانی میں مبتلا ہوگا تو علمی زندگی سے علٰیحدگی اختیار کرکے اسی میں لگ جائے گا، مجھے کوئی فن آتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا، اچھا ہوا کہ کوئی ہنر نہیں جانتا تھا، اور حالات کے خارزاروں سے گزرتا ہوا اپنے علمی دامن کو بچائے رکھا، مگر یہ ہر مولوی کے بس کی بات نہیں ہے۔

رابطۃ الادباء کا قیام اور مرآۃ العلم کی تالیف:۔اسی زمانہ میں پروفیسر محمد حسن الاعظمی ازہری اپنے وطن مبارکپور آئے، اور انھوں نے یہاں رابطۃ

الادبــاء کے نام سے ایک علمی انجمن قائم کی، اور طے پایا کہ اس انجمن کی طرف سے ایک ماہوار قلمی رسالہ عربی زبان میں نکالا جائے تا کہ طلبہ و مدرسین کو عربی زبان میں لکھنے کی مشق ہو۔ اس رسالہ کی ادارت میرے ذمہ تھی، چند نمبر نکل سکے جن میں اساتذہ کے مضامین عربی میں ہوتے تھے۔ اسی دوران میں نے اپنی کتاب ''مرآۃ العلم'' کو تالیفی شکل دی، جس کو زمانہ طالب علمی میں جمع کیا تھا، گویا طباعت کے لئے تیار ہوگئی، اس کے آخر میں لکھا: کنت ألّفتُ هٰذ الکتٰبَ فی زمن الطلب ثُمَّ بَیَّضْتُهٗ وسَمَّیْتُهٗ. ''مِرآۃ العلم'' ١٣٦٣ھ میں اس کو مدرسہ سے شائع کرنے کا ارادہ تھا، اس کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا: تحت إدارۃ مجلس احیاء العلوم الاسلامیه مبارکفور اعظم گڈہ (الھند) اسی دوران ''جمال الدین افغانی کے رسالہ ''الوحدۃ الاسلامیه'' اور بعض دوسرے رسالوں کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا، شباب کمپنی بمبئی (ابنائے مولوی محمد بن غلام رسول السورتی تجار الکتب جاملی محلّہ بمبئی کی قائم کردہ) سے خط و کتابت کر کے اسی کے لئے یہ ترجمہ کیا تھا، جس کے معاوضہ میں دس روپیہ اور ایک کاپی، اور میرے نام و پتہ کی انگریزی میں ربڑ کی ایک مہر آئی تھی، میں نے معاوضہ کے سلسلہ میں انھیں پر فیصلہ چھوڑ دیا۔ جس پر انھوں نے خط میں یہ مصرعہ لکھا:

آپ نے الجھن میں الجھن ڈال دی

میں نے اس کے جواب میں لکھا ؎

میں نے کیا الجھن میں الجھن ڈال دی	ہمنواؤں میں بھی تیرا عندلیب

اور جب بمبئی پہونچا تو یہ ہمارے مخلص مولوی عبدالعزیز نکلے، جو کتب خانہ کے مالک تھے، اسی زمانہ میں ان کو میں نے اپنی نظم ''اصحاب صفہ'' جو تقریباً ڈھائی سو اشعار پر مشتمل تھی، اس کو شائع کرنے کے لئے دیا مگر شائع نہ ہوسکی، اور نہ ہی مجھے مل سکی۔ اس دور میں تصنیفی و تالیفی ذوق کی تسکین نہ ہوسکی، نہ مضمون نگاری باقی رہ سکی،

البتہ شعر وشاعری اپنے پورے عروج پر تھی، تنگ دستی اور پریشان خاطری میں فطری اور ذہنی پرواز میں کوتاہی نہیں آئی، بلکہ اس میں تیزی اور توانائی آ گئی، (۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک کا) یہ دور ہندوستانی سیاست میں بڑا ہنگامہ خیز گزرا ہے۔ دوسری جنگ عظیم جاری تھی، ہندوستان کی آزادی کا عمل تیز تر ہو رہا تھا، پورا ملک فسادات اور سیاسی ہنگاموں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا، اور یہ دور میری مدرسی کا ہے، جس میں ۱۵/اور ۱۸/ روپئے میں گزر کرنا پڑا، گھریلو پریشانی الگ تھی، اس میں میری شاعری کا شباب تھا، غزلوں میں ذاتی رجحانات کی عکاسی ہوتی تھی، اور نظموں میں تحریک آزادی کا رنگ ہوتا تھا، ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک میری غزلیں اور نظمیں سہ روزہ ''زمزم'' لاہور، اور سہ روزہ ''مسلمان'' اور بعد میں ''کوثر'' لاہور میں مستقل طور سے شائع ہوتی تھیں، کئی غزلیں اور نظمیں ''مدینہ'' بجنور میں بھی شائع ہوئیں، اور جیسا کہ معلوم ہوگا کہ میری شاعری نے مجھے امرتسر اور لاہور پہونچایا، گرانی ونایابی کا دور تھا، ذریعۂ آمدنی بالکل محدود تھا، طرح طرح کی الجھنیں تھیں، میں مدد کیا کرتا، اپنا اور بال بچوں کا خرچ پورا نہیں کرسکتا تھا، اس لئے مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسی کے کچھ دنوں بعد مجھے وقتی طور پر اپنے خورد ونوش کا انتظام الگ کرنا پڑا، اور میں موجودہ مسکونہ مکان میں آ گیا، جس میں اس وقت اندر اور باہر دو کمرے تھے، خالد کمال اور انور جمال دو بچے تھے، اور زوجین کل چار نفر تھے، انور جمال بچپن ہی سے ''خنازیر'' کا مریض تھا، اسی تنخواہ میں گزر بسر کرنا تھا، اور بچہ کا علاج بھی، اس دور میں ایسا بھی ہوا کہ آٹا گھول کر اور نمک کے ساتھ پکا کر وقت کاٹ لیا گیا، بسا اوقات سالن کی جگہ پیاز، لیموں، مرچ اور نمک کا کچومر استعمال کیا، دو پیسے ایک آنے کا گوشت بہت آسانی سے کام دیتا تھا، اس زمانے میں آج کی طرح گرانی اور نایابی نہیں تھی، مگر اس دور کے لحاظ سے گرانی تھی، ایک روپیہ کا ڈیڑھ پونے دو سیر گیہوں، چاول ملتا تھا، مگر لوگوں کے پاس پیسہ نہیں تھا، اس لئے بڑی غربت تھی۔ اعظم گڈھ سے ۱۲/آنے کی ایک انگیٹھی لایا، ایک آنے کا گڑ

(بھیلی) صبح کو لاتا اور چائے بن جاتی تھی، اور رات کی بچی کھچی روٹی ناشتے میں کام آتی، بعض اوقات اس کا بھی انتظام نہیں ہوتا تھا، آج کے دور میں اس صورتحال کو غربت اور افلاس سے تعبیر کیا جائے گا۔ کیونکہ آج گرانی اور نایابی کے باوجود لوگ بہتر سے بہتر کھاتے ہیں، اور بہتر سے بہتر پہنتے ہیں، مگر اس زمانہ میں بڑے سکون کی زندگی تھی، اور جو کچھ ہوتا تھا امور خانہ داری کے تحت ہوتا تھا، اس زمانہ میں مختصر سی تنخواہ پانے والے مدرسین بہت خوشحال اور مطمئن مانے جاتے تھے اور لوگ ان پر رشک کرتے تھے، خود میرے یہاں اس زمانہ میں احباب واضیاف کی پُرتکلف (اس وقت کے لحاظ سے) دعوت ہوتی تھی، بچوں کی والدہ میرے علم کے بغیر انتظام کے طور پر بچا بچا کر رکھتی تھی، اور اسی مختصر سی آمدنی میں ہر کام چلتا تھا، اس دور میں اپنی غربت کا کبھی احساس تک نہ ہوا، اور نہ صحت وتندرستی پر کوئی اثر پڑا، بلکہ چار سے اچھا کھایا اور پہنا، روکھے کھانے میں جو لذت اس وقت ملتی تھی، آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، یہی حال صحت وتندرستی کا تھا۔

<u>مدرسہ کی تنخواہ میں برکت</u>:۔ واقعی معلموں اور مدرسوں کی تنخواہ میں بڑی برکت ہوتی ہے، وہ مختصر سی آمدنی میں خوش خوری اور خوش پوشی میں اس مقدار کی آمدنی والے عوام سے ممتاز ہوتے ہیں، صحت وتندرستی بھی اچھی رہتی ہے، کیونکہ اس میں مسلمانوں کی حلال روزی کی اجتماعی برکت شامل ہوتی ہے، مگر اب یہ بات باقی نہیں رہی۔ کیونکہ مدارس کی آمدنی میں حلال وحرام کی تمیز بہت کم رہ گئی ہے، اور آنکھ بند کر کے چندہ وصول کیا جاتا ہے، پہلے زمانہ میں لوگ اپنی حلال کمائی سے مدرسوں کی امداد کرتے تھے، جس کا فیض ظاہر ہوتا تھا، نیز رسول اللہ ﷺ نے دینی علم کے معلم ومبلغ کے حق میں دعا فرمائی ہے۔: **نَضَّرَ اللهُ اِمْرأً سمع مقالتی فوعاها ثم بلغها**، یہ دعا ہر قسم کی بشاشت وشادابی کے لئے ہے۔ اور اس برکت کا ظہور اہل علم کی قناعت اور میانہ روی سے ہوتا ہے، **اَللّٰھم ارزقنی کفافاً وقنعنی بما رزقتنی** اور

الاقتصاد نصف المعیشة.

اس وقت یکہ کا کرایہ اسٹیشن تک ۲/آنہ اور ریل کا کرایہ مئو تک ۴/آنہ تھا۔ میں دوستوں کی ملاقات کے لئے اکثر مئو جاتا تھا، یہاں سے پیدل محمد آباد جاتا تھا، اس وقت پیدل چلنا عام رواج تھا، بچوں کے نانہال کی خیریت وغیرہ معلوم کرکے ۲/آنہ ریل کا کرایہ دے کر مئو چلا جاتا تھا اور واپسی پر محمد آباد اتر کر پیدل چلا آتا، اس لئے ۱۲/آنے کے بجائے صرف ۴/آنے میں کام چل جاتا تھا اور ۸/آنے کی بچت ہوجاتی تھی، آمدنی کے مطابق خرچ کرنا اقتصاد ہے، جو نصف معیشت ہے، میں نے اس دور میں کسی سے قرض نہیں لیا، اور نہ ہی بعد میں یہ کام کیا، حالانکہ اس دور میں اور اس کے بعد کئی نازک وقت آئے۔

احیاء العلوم سے علیحدگی:۔ تقریباً پانچ سال تک احیاء العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی، شروع ہی سے پڑھنے پڑھانے کا مزاج تھا، اور اسی میں رہنے کا ارادہ تھا۔ غالباً مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد تنخواہ میں اضافہ ہوا، اور ۱۵/روپیہ سے ۱۸/روپیہ ہوگئی، خیال تھا کہ اگر ۲۵/روپیہ تنخواہ ہوجائے گی تو تدریسی خدمت کرتا رہوں گا، مگر اس کی توقع نہیں تھی، تین روپیہ کے اضافہ ہی پر مدرسہ کے بعض اراکین طنز و مزاح سے غیرت کو ٹھیس پہونچاتے تھے، اسی درمیان مدرسہ اور مدرسین کے معاملات نازک صورت اختیار کر گئے، مدرسہ کی مجلس شوریٰ ہوئی، اور ۲/بجے رات تک گفتگو ہوتی رہی، مدرسین بھی موجود تھے، اراکین کے ہتک آمیز رویہ پر میں نے رات ہی میں استعفاء دے دیا، استعفاء کی عبارت کچھ اس طرح تھی،:

> ''مدرسی اور معلّمی کے شریف دامن کو جب ''جہالت کے شرارے'' جلا دینا چاہتے ہوں تو ایسی حالت میں علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے، فی الحال میری اس تحریر کو استعفاء سمجھا جائے، ویسے مدرسہ اپنا ہے۔ آئندہ حسب قدرت خدمت سے دریغ نہیں ہوگا۔''

ارکان کمیٹی نے کہا کہ ان کو بلا کر پوچھا جائے کہ ''جہالت کے شرارے'' کیوں لکھا، مگر بعض سمجھدار ارکان نے کہا کہ جب وہ علیحدہ ہو رہے ہیں تو آزادی سے مزید تندو تلخ باتیں کر سکتے ہیں، اور میرا استعفاء منظور ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

امرتسر کا سفر

غالباً ۲۴رنومبر ۱۹۴۴ء کو پہونچا تھا

مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر میں ملازمت:۔ قیام مبارکپور کا زمانہ میری شاعری کے شباب کا زمانہ ہے، غزلیں اور نظمیں خوب کہتا تھا، تغزل میں اصغر گونڈوی مرحوم سے زیادہ متأثر تھا، ان کے دونوں دیوان ''نشاطِ روح'' اور ''سرودِ زندگی'' مطالعہ میں رہ چکے تھے، نظموں میں احسان دانش کا تتبع کیا، اسی کے ساتھ سیاسی نظمیں بھی کہتا تھا، میری غزلیں اور نظمیں لاہور کے سہ روزہ ''زمزم'' میں اور سہ روزہ ''مسلمان'' بعد میں ''کوثر'' میں زیادہ شائع ہوتی تھیں، کئی غزلیں اخبار ''مدینہ'' بجنور میں بھی چھپیں، اس وجہ سے ''زمزم'' اور ''مسلمان'' دونوں اخبار مستقل طور میرے نام آتے تھے۔ غزلیں ''مئے طہور'' کے عنوان سے چھپتی تھیں، ''زمزم'' میں مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر کے مضامین پورے ایک صفحہ میں شائع ہوتے تھے، جن میں شیعوں اور قادیانیوں کا رد ہوتا تھا، اس تنظیم کے روح رواں مولانا سید نور الحسن بخاری دار العلوم دیوبند کے فاضل تھے، ان کا وطن ملتان تھا، وہ میری غزلوں اور نظموں کو پڑھتے تھے، اور غائبانہ تعارف تھا، میں نے ان کو لکھا کہ ''مرکز تنظیم اہل سنت'' میں گنجائش ہو تو مجھے بلالیں، آپ کے علمی اور دینی کاموں میں تعاون کروں گا، انھوں نے بڑے انشراح سے لکھا کہ ''مرکز تنظیم میں تیس روپیہ ماہوار اگر منظور ہو تو آجایئے'' ایک حسبۃً للہ، پھر ۱۵ر روپیہ ماہوار، پھر ۱۸ر روپیہ ماہوار، اور ۳۰ر روپیہ کی اطلاع سے انشراح ہوا، اور

امرتسر جانے کی تیاری کی ،نومبر کا مہینہ تھا، پنجاب کی سردی مشہور ہے،اس وقت والد مرحوم بسلسلۂ تجارت الہ آباد میں تھے، میں یہاں سے الہ آباد گیا، وہاں جاڑے کے کپڑے بنوائے ،اوراس طرح امرتسر روانہ ہوا،الہ آباد سے ایک ٹرین لکھنؤ آرہی تھی، جس ڈبہ میں گیا، اس میں سکھ فوجی تھے۔ اندر داخل نہیں ہونے دے رہے تھے،مگر جب معلوم ہوا کہ میں امرتسر جارہاہوں تو بڑی خوشی سے جگہ دی،اورتاکید کی سگریٹ نہ پینا،لکھنؤ سے دہلی جانے والی گاڑی پر سوار ہوا تواس میں ایک مسلمان تھا، جو رستہ بھر انجن سے گرم پانی لاکر ۵ چائے بناتا اور مجھ کو بھی پلاتا تھا، راستہ میں مرادآباد اتر گیا، ایک روز مدرسہ شاہی میں رہ کر دوسرے دن رات کوامرتسر کیلئے روانہ ہوا،طلبہ جن میں بعض مبا کپوری شاگرد تھے، اسٹیشن ساتھ آئے ، اور غالباً بارہ بجے رات میں گاڑی امرتسر کے لئے روانہ ہوئی ،اور دوسرے روز شام کو۴ ؍بجے امرتسر اسٹیشن پر پہونچا، غالباً۲۴؍نومبر ۱۹۴۴؁ء کی تاریخ تھی ، ۲۷، ۲۸ سال کی عمر تھی ، دس ماہ مرادآباد میں رہا، اسی درمیان ایک مرتبہ دہلی گیا تھا۔اس سے زیادہ اوراس سے آگے کبھی سفرنہیں کیا تھا، اورسفر بھی کیا تو پنجاب جیسے دور دراز مقام کا،اسٹیشن کے قلی پنجابی میں بات کرتے تھے ، میں نے ایک قلی کے سر پر سامان (بکس، بستر) رکھا،اورشریف لاج، کٹرہ مہان سنگھ چلنے کو کہا،غروب کے قریب جب منزل مقصود پر پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا نورالحسن صاحب لاہور گئے ہیں کل آئیں گے، ایک صاحب نے ایک کمرہ کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں سامان رکھو۔

بھوک کی شدت تھی ، میں سامان رکھ کر باہر نکلا کہ کہیں ہوٹل ہوتو کچھ کھا پی لوں ،مگر بالکل اجنبی تھا، راستہ بھول جانے کے ڈراور زبان نہ جاننے سے ،قریب ہی ایک دوکان دیکھی ، اندازہ ہوا کہ کھانا ملتا ہے، اوپر گیا، یہ انتہائی گندہ، عامی ہوٹل تھا، چٹائی کی درازوں میں کالی کالی مٹی جمی ہوئی تھی ، اس پر بیٹھنا اور کھانا بڑی بدذوقی کا مظاہرہ تھا،مگر اجنبیت اور بھوک نے اس کو گوارا کیا، دو روٹی اور دال کی قیمت ۲؍آنے تھی ،

مالک نے کہا کہ یہاں دال کا پیسہ نہیں لیا جاتا دوروٹی دوآنے کی ہے۔ وہاں سے نکل کر مٹی کا ایک چراغ خریدااوراس میں تیل ڈالا، اور کمرے میں آکر بتی تلاش کی، اس طرح چراغ جلاکر مسافرت کی پہلی رات کا استقبال کیا، سفر کی تکان تھی، جلد ہی سو گیا، دوسرے دن شام کو مولانا نورالحسن صاحب لاہور سے تشریف لائے اور تپاک سے ملے، غیر حاضری کی معذرت کی، امرتسر کے مشہور تفریحی مقام یا پارک رام باغ لے گئے، اور میرے کھانے کا انتظام اپنے یہاں کیا، ان کے بال بچے بلڈنگ کے پہلے منزلہ پر رہتے تھے، اور وہیں سے کھانا ناشتہ آتا تھا۔

شریف لاج کٹرہ مہان سنگھ کے چاروں طرف کئی منزلہ بلڈنگیں تھیں، درمیان میں بہت بڑا صحن تھا، اندر داخلہ کا راستہ پورب، پچھم دونوں طرف بلڈنگیں تھیں اوپر چھت تھی، رات میں بجلی جلتی تھی، اس طرح یہ لمبا راستہ یا گلی اندھیرے میں گزرنا مشکل تھا، ایک بڑے صحن میں ایک طرف کچھ بھینسیں تھیں، جن کے نگراں کچھ پنجابی (پنڈو) لڑکے تھے، امرتسر پہلے احباب یہی دیہاتی لڑکے تھے، جو خالص پنجابی زبان بولتے تھے، بعد میں امرتسر کے غزنوی خاندان کے ایک صاحبزادے خالد میرے پاس آیا کرتے تھے، اور ان سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی، ایک اور نوجوان جو اسی طرف لاج میں رہتا تھا، میرے پاس آیا کرتا تھا، بعض کھانے کی کچھ چیزیں بھی لاتا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ دوم مرزا بشیرالدین کا پوتا یا کوئی رشتہ دار ہے،

مولانا مضامین لکھتے تھے، میں ان کی مدد کرتا تھا، اس زمانہ میں امرتسر سے لاہور کا کرایہ ۶/آنہ تھا، درمیان میں تیس میل کا فاصلہ تھا، راستہ جلو اٹاری، تاج پوری وغیرہ اسٹیشن پڑتے تھے، لاہور میرے خوابوں کی تعبیر تھا، یہیں کے اخباروں میں میرے اشعار شائع ہوتے تھے، مدرسہ میں یہاں کے ادبی رسائل ''نیرنگ خیال''، ''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' وغیرہ آتے تھے، دہلی لکھنؤ کے بعد لاہور اردو ادب کا مرکز تھا، شعراء وادباء کا مجمع تھا، پہلی بار لاہور پہونچا تو اجنبیت اور پنجابی زبان

سے ناواقفیت کی وجہ سے انارکلی بازار اور موہن روڈ پوچھتا ہوا پیدل ''زمزم'' کے دفتر میں پہونچا، جو پیسہ اخبار گلی کے پاس پہلے منزلہ پر تھا، کسی سے جان پہچان نہیں تھی، ہر چیز اور ہر شخص میں انسیت واجنبیت کا ملا جلا احساس تھا، مگر دفتر میں تمام عملہ مغربی یوپی کا تھا، جس سے یک گونہ اطمینان ہوا، مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم سے غائبانہ یوں واقفیت تھی کہ ان کا نام سب سے پہلے اخبار ''الجمعیۃ'' کے حلقہ ادارت میں دیکھا تھا، پھر اخبار ''مدینہ'' بجنور کی ادارت میں دیکھا اور اب وہ اخبار ''زمزم'' کے اڈیٹر تھے، منشی عبدالرحیم ساقی منیجنگ ڈائریکٹر تھے، کاتب اور ملازم بھی بجنور، گنگوہ وغیرہ کے تھے، میں نے اپنا نام ونشان نہیں بتایا، دسمبر کی ابتدائی کوئی رات تھی، رات کو دفتر بند ہونے لگا، تو منشی عبدالرحیم صاحب نے کہا کہ آپ مولانا نورالحسن صاحب کے آدمی ہیں، ان کا بستر وغیرہ دفتر میں ہے، آپ بھی یہیں سوجایئے، میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں اجنبی آدمی ہوں، دفتر میں رات کو سونا مناسب نہیں ہے، میں رات کو دفتر میں چوری کرکے چلا جاؤں تو آپ کیا کرسکتے ہیں، بہتر ہے کہ دفتر بند کرکے باہر گیلری میں کرسی رکھوادیں، اسی پر رات بسر کرلوں گا، اجنبی شخص پر پورا دفتر چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، میں اپنی بات پر اصرار کرتا رہا، اور وہ کہتے رہے کہ سخت سردی پڑ رہی ہے، رات باہر کرسی پر کیسے گزار سکتے ہیں، مولانا نورالحسن صاحب نے آپ کو بھیجا ہے، جب انھوں نے آپ پر اعتماد کیا ہے تو ہم بھی اعتماد کرتے ہیں، بہرحال منشی عبدالرحیم صاحب نے دفتر میرے حوالہ کردیا۔ اور میں نے لاہور کی پہلی رات وہاں گزاری۔

اس کے بعد عام طور پر ہفتہ میں دوبار لاہور آتا جاتا رہا۔ اور اجنبیت ختم ہوتی رہی، مگر اب بھی میں نے اپنا نام ونشان نہیں بتایا، اس درمیان میری بعض غزلیں بھی حسب سابق ''زمزم'' میں چھپتی رہیں۔ اور پیسہ اخبار، انارکلی بازار میں گھومتا پھرتا رہا، ابتداء میں ہوٹل وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا تھا، کئی راتیں پھل وغیرہ کھا کر رہا، بعد میں پیسہ اخبار کے ایک ہوٹل میں کھانے لگا۔ ایک مرتبہ امرتسر سے لاہور جارہا تھا، میرے

قریب ایک بوڑھا پنڈو (دیہاتی) بیٹھا تھا، اس نے مجھے مولوی صورت دیکھ کر حیاتِ مسیح کی بحث چھیڑ دی، وہ قادیانی تھا، اس نے مشہور حدیث ''لوکان موسیٰ حیاً ماوسعہٗ اِلا اتباعي'' کے مقابلے میں ملاعلی قاری کے حوالے سے بتایا کہ ایک حدیث میں ''لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیاً'' ہے، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس حدیث سے وفات مسیح ثابت ہوتی ہے۔ باطل مذہب والے جاہلوں کو صرف پھنساتے ہی نہیں، بلکہ ان کو اپنا مبلغ بھی بناتے ہیں۔

ایک مرتبہ ''زمزم'' میں مضمون دے کر امرتسر آیا تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی اہم تبدیلی ضرور ہوئی ہے، اس لئے چار بجے رات کو جانا پڑا، شریف لاج والا راستہ دور تک یوں تھا کہ دونوں جانب بلڈنگیں تھیں، اور اوپر چھت تھی، راستے کی بجلی بجھی ہوئی تھی، اندھیرا گھپ تھا، میں اس میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا بیچ راستے میں ایک بیل بیٹھا تھا، میں اس پر گر پڑا اور بیل گھبرا کر بھاگنے لگا، نہ میں اس کو دیکھتا تھا، اور نہ وہ مجھ کو دیکھتا تھا، دونوں ایک دوسرے سے ڈرتے تھے، میں درمیان میں نہ ادھر جا سکتا تھا نہ ادھر جا سکتا تھا، کچھ دیر کھڑا رہا، پھر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھتا رہا، حتیٰ کہ بخیر وعافیت یہ خطرناک منزل طے ہوگئی۔

<u>ایک لطیفہ</u>:۔ایک مرتبہ مولانا نورالحسن بخاری کوئی مضمون مجھ سے لکھوا رہے تھے، انھوں نے اپنے ملتانی لہجے میں ''عُجب وریاء'' کا جملہ استعمال کیا، میں اس کو بالکل نہیں سمجھ سکا، اور جوں کا توں ''اُج بُریا'' لکھ دیا، بعد میں انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے، میں نے کہا کہ جو آپ نے کہا وہی میں نے لکھا، تو انھوں نے لکھ کر بتایا کہ میں نے ''عُجب وریاء'' کہا تھا، مگر ملتانی پنجابی لہجہ کی وجہ سے آپ اس کو نہیں سمجھ سکے، تنظیم کے صدر محمود خان نواب لغاری اور مولانا ایک مرتبہ بات کر رہے تھے، مجھے اندازہ ہوا کہ کسی معاملہ میں دونوں جھگڑا کر رہے ہیں، میں نے منع کیا تو مولانا نے کہا کہ ہمارے یہاں کا یہی لب ولہجہ ہے، ایک مرتبہ کسی بات پر میں نے ''لال'' کے بجائے ''لال

والا'' کہہ دیا تو مولانا نے تنبیہی لہجہ میں کہا کہ ''لال والا'' کیا؟ صرف ''لال'' کافی ہے ،آپ لوگ یوپی والے اہل زبان ہیں، ہم آپ سے اردو سیکھتے ہیں، آپ ہی لوگ اس قسم کے الفاظ استعمال کریں گے تو حجت بن جائیں گے، امرتسر پہونچنے کے دو ایک دن بعد ایک مسجد مین نماز پڑھنے گیا، وہاں ایک صاحب کوٹ پتلون میں جلدی جلدی نماز پڑھ رہے تھے، رکوع وسجود بھی ٹھیک سے نہیں کرتے تھے، میں نے ان کو ٹوک دیا، اس پر وہ مجھ پر برس پڑے، اور مولویوں کو بہت سخت سست سنایا، میں اپنی اجنبیت اور بے زبانی پر خاموش سنتا رہا۔

قیام امرتسر بہت مختصر رہا، اس مدت میں شہر سے کوئی خاص انس وتعلق پیدا نہیں ہو سکا، ویسے بھی وہاں کوئی علمی وادبی سرگرمی نہیں تھی، البتہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی ذات مرجع تھی، وہ مبارک پور کے اہل حدیث علماء خاص طور سے مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوریؒ، مولانا عبدالسلام مبارکپوری وغیرہ سے خاص تعلق رکھتے تھے، میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا تھا، ہال بازار میں مشرقی جانب ثنائی پریس ان کے صاحبزادے مولانا عطاء اللہ چلاتے تھے، اسی کے قریب مولانا کا مکان تھا، ہفتہ وار ''اہلحدیث'' جاری تھا، مولانا پرانے طرز کے ایک بڑے مکان میں پہلے منزلہ پر قیام فرماتے تھے، ایک صاحب فتویٰ لکھنے پر مامور تھے، مولانا بولتے تھے اور وہ لکھتے تھے، جب میں پہونچ جاتا تو مولانا ان سے کہتے کہ ان کو لکھنے کو دے دو، یوپی والوں کا خط اور ان کی زبان دونوں اچھے ہوتے ہیں، اس طرح مولانا نے کئی فتاوے مجھ سے لکھوائے، میرے لئے یہ شرف باعث فخر ہے، مولانا میرا بہت لحاظ فرماتے تھے اور بڑے انشراح سے ملتے تھے۔

ہال بازار کی مسجد خیرالدین میں کبھی کبھی نماز پڑھنے چلا جاتا تھا، کبھی ثنائی پریس میں امرتسر کے قیام کے دوران سکھوں کا سنہری گرودوارہ اور جلیان والا باغ تک نہیں دیکھا، شاید کچھ مدت وہاں قیام رہتا تو کوئی حلقۂ احباب پیدا ہو جاتا، ویسے وہاں جی

نہیں لگتا تھا، کچھ دوری پر لاہور تھا، جس مین ہر طرح کی کشش تھی، اسی دوران میں ایک مرتبہ سونی پت ضلع کرنال میں ایک دینی جلسہ میں مرکز تنظیم اہل سنت کی طرف سے گیا، سخت سردی کا زمانہ تھا، چار پانچ سیر روئی کی رضائی اور بستر کے ساتھ امرتسر سے کالکا میل میں سوار ہوا، اورامبالہ تک بستر لئے کھڑا کھڑا آیا، پلیٹ فارم پر سویا، صبح سونے پت کی گاڑی پر وہاں گیا، وہاں سے دہلی آیا، اور وہاں سے پھر امرتسر واپس گیا، الغرض ۲۵/نومبر ۱۹۴۴ء سے ۱۲/جنوری ۱۹۴۵ء تک تقریباً ڈیڑھ ماہ امرتسر میں قیام رہا، اس کے بعد مستقل طور سے لاہور چلا گیا، اس درمیان میں کوئی علمی یا ادبی کام نہیں ہو سکا۔

☆☆☆☆☆☆

امرتسر سے لاہور

بتا چکا ہوں کہ میں امرتسر سے مرکز تنظیم اہل سنت کے نشریات کے سلسلے میں لاہور جایا کرتا تھا، اور اکثر رات کو اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں سوجاتا تھا، اسی درمیان میں پنجاب کے کسی کالج کے پروفیسر پنجاب یونیورسٹی میں امتحان دینے کے لئے آئے، اور اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں قیام کیا، ایک رات وہ ''دیوان غنی کشمیری'' کا مطالعہ کر رہے تھے۔ جو نصاب میں داخل تھا، ایک غزل کے اشعار حل کرنے میں ان کو مشکلات درپیش تھیں اور دیر تک الجھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھ کر کہا کہ کتاب لایئے، میں بھی ذرا دیکھوں اور تھوڑی دیر مطالعہ کرنے کے بعد میں نے پوری غزل کا مطلب ان کو سمجھا دیا، انھوں نے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ میں نے جب اپنا وطن ''اعظم گڈھ'' بتایا تو انھوں نے کہا کہ جبھی آپ نے ان مشکل اشعار کو اتنی جلدی حل کر دیا، ہندوستان کا کوئی علمی ادارہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس میں اعظم گڈھ کا کوئی عالم نہ ہو، اس کے بعد انھوں نے میرا نام وغیرہ دریافت کیا، اور میں نے بتا دیا۔

صبح کو انھوں نے مولانا محمد عثمان فارقلیط اور منشی عبد الرحیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کرکے میرا نام وغیرہ بتایا، اس کے بعد دونوں صاحبوں نے مجھے بلا کر سخت فضیحت کیا، اور کہا کہ اب تک آپ نے اپنے کو چھپائے رکھا، اس کے بعد دفتر کے تمام عملہ سے خاص تعلق پیدا ہوگیا، اور سب لوگ خلوص ومحبت سے پیش آنے لگے، ''زمزم'' میں میرے اشعار ۱۹۴۱ء سے شائع ہوتے تھے، (۱۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء میں میری پہلی غزل ''اسرار'' کے عنوان سے ''زمزم'' میں چھپی، ۹ر اشعار تھے، مطلع یہ تھا:

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ بے خودیٔ خودی میں ڈوب، سرقلندری سمجھ)

جن میں غزلیں، نعتیں، قومی وسیاسی نظمیں ہوا کرتی تھیں، اور دفتر والے غائبانہ مجھے جانتے تھے، اس طرح میری شاعری امرتسر اور لاہور تک آنے کا ذریعہ بنی بلکہ اس نے مجھے بمبئی تک پہونچایا۔

منتخب التفاسیر کا منصوبہ:۔ چند دن کے بعد منشی عبد الرحیم صاحب اور مولانا فارقلیط صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ وہاں کیا کرتے ہیں، یہاں چلے آیئے، ہم آپ کو ساٹھ روپیہ ماہوار دیں گے، ''زمزم لمیٹڈ کمپنی، لاہور'' کی طرف سے ایک تفسیر شائع ہونے والی ہے۔ مولانا فارقلیط کی نگرانی میں یہ کام ہوگا، آپ اس کے جمع وترتیب کی ذمہ داری سنبھال لیں، اس کی صورت یہ ہوگی کہ ہندوستان میں مروجہ تمام تفسیروں کا خلاصہ یکجا کیا جائے گا۔ طویل مباحث کا اختصار ہوگا، اہم اور مختصر مضامین کی تشریح ہوگی، اس کام کے لئے کمپنی نے دولاکھ روپیہ منظور کیا ہے، ایک لاکھ تالیف وترتیب اور طباعت واشاعت پر خرچ ہوگا، حاشیہ پر تفسیر ہوگی، قرآن کے متن، ترجمہ اور تفسیر میں سے ہر ایک کی طباعت مختلف رنگ میں ہوگی۔ یہ ایک مستقل کام ہے، اس کے بعد آپ اخبار ''زمزم'' سے آپ منسلک ہوجائیں گے، لاہور علمی وادبی مقام ہے، یہاں ترقی کے مواقع ہیں۔ الغرض مجھے ہر طرح تیار کرنے کی کوشش کی گئی، میں بھی اس موقع اور پیشکش کو غنیمت سمجھتا تھا، مگر خیال ہوتا تھا کہ ''مرکزی تنظیم اہل

سنت'' کی دعوت پر آیا ہوں، ابھی چند دن ہوئے ہیں، مولانا نورالحسن صاحب سے اس کا تذکرہ کس انداز میں کروں؟ کئی دن اسی حیص بیص میں رہا، اور ایک دن اس کا تذکرہ مولانا نورالحسن صاحب سے کردیا، انھوں نے نہایت خوشی سے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے، چلئے میں بھی منشی صاحب اور مولانا فارقلیط صاحب کو آپ کے بارے میں مزید معلومات دے دوں۔ میں بھی جنوری سے آپ کی تنخواہ پچاس روپیہ کرتا، مگر جب اس سے زیادہ کی بات ہے، اور کام بھی دینی وعلمی ہے تو ضرور آپ جایئے، آپ ضروریات زندگی کے سلسلے میں وطن سے نکلے ہیں، اس لئے جہاں زیادہ سہولت ملے، جانا چاہئے، مولانا نورالحسن صاحب نہایت بااخلاق، قدرشناس، اور حساس عالم تھے، ان کو اہل علم کی ضرورت کا پورا احساس تھا، بعد میں انھوں نے لاہور جاکر میرے بارے میں مولانا فارقلیط اور منشی عبدالرحیم سے بات کی اور میرا لاہور جانا طے ہوگیا، چنانچہ میں ۱۳/جنوری ۱۹۴۵ء کو اپنا بکس بستر لے کر لاہور چلا گیا۔

منتخب التفاسیر کی ابتداء:۔ اخبار ''زمزم'' کے دفتر میں ایک کمرہ اس کام کے لئے مخصوص کیا گیا، میز، کرسی، قلم، دوات، کاغذ اور دیگر چیزیں مہیا کی گئیں، مولانا تھانوی کے ترجمہ کا ایک حمائل دیا گیا، اور تفسیر میں، تفسیر ''بیان القرآن''، تفسیر حقانی، تفسیر ثنائی، ترجمان القرآن، تفہیم القرآن اور تفسیر ماجدی کے مطبوعہ حصے جمع کئے گئے، کمرہ کے دروازے پر پردہ ڈال دیا گیا کہ سکون واطمینان سے ''منتخب التفاسیر'' کے نام سے ایک ایسی تفسیر تیار کی جائے، جس میں ہندوستان کے مفسرین کی تفسیروں کا خلاصہ آجائے، میں دو ایک دن تک بیٹھا سوچتا رہا کہ کام کیسے شروع کروں، کام بڑی ذمہ داری کا تھا، ذمہ داران نے میرا انتخاب کچھ سمجھ کر کیا تھا، اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا، منشی عبدالرحیم صاحب بار بار جھانکتے تھے اور دیکھتے تھے کہ میں الجھن میں ہوں تو دوسرے یا تیسرے روز خود ہی کہا کہ کام مشکل ہے، آپ کی تنخواہ ساٹھ نہیں بلکہ سو روپیہ رہے گی، میں نے اس بے طلب اضافہ پر اللہ تعالیٰ کا اور منشی صاحب کا

شکریہ ادا کیا کہ ۱۵ سے ۱۸ پھر ،۳۰ پھر ۶۰ اور اب ۱۰۰ر تنخواہ ملنے لگی ہے، کچھ دن کے بعد کام قابو میں آ گیا، اور دن میں تقریباً دو صفحہ لکھ لیا کرتا تھا۔

مکان آنا اور انور جمال کا انتقال:۔ ابھی لاہور آئے بارہ تیرہ دن ہوئے تھے، اور کام اچھی طرح قابو میں نہیں آیا تھا کہ گھر سے عزیزم انور جمال مرحوم کی بیماری کا خط آیا، وہ بچپن سے خنازیر کے خطرناک مرض میں مبتلا تھا، اور اس زمانہ کی وسعت اور حیثیت کے لحاظ سے میں نے ہر طرح کا علاج کیا مگر اس میں کمی نہیں ہوئی، اسی حال میں چیچک نکل آئی، اور آنتوں تک پھیل گئی، میں ۲۶ر جنوری ۱۹۴۵ء کی شام لاہور سے چل کر ۲۸ر جنوری کو دو پہر میں گھر پہونچا تو دیکھا کہ انور جمال اور اس کا بڑا بھائی خالد کمال دونوں شدید چیچک میں مبتلا ہیں، انور جمال ۲۸ر فروری ۱۹۴۵ء کو انتقال کر گیا، اس وقت اس کی عمر سات سال کی تھی، خالد کمال اس لائق نہیں تھا کہ اپنے بھائی کے جنازہ میں شریک ہو سکے، یہ بچہ نہایت حسین و جمیل تھا، میں اس سے اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا، بڑا نازک مزاج اور نفاست پسند تھا، مجھے اس کے انتقال کا بہت زیادہ غم ہوا۔

لاہور واپسی اور مشاہرہ میں اضافہ:۔ چند دن گھر رہ کر لاہور چلا گیا، غالباً اس کے بعد ہی ’’زمزم کمپنی لمٹیڈ‘‘ کے ارکان نے میری تنخواہ میں خود بخود اضافہ کر کے ۱۶۰ر روپیہ ماہوار کر دیا، اصل میں یہ کام جتنا دقت طلب ہوا، اسی کے پیش نظر حق المحنة میں اضافہ ہوتا رہا۔

لاہور کی ایک خصوصیت اور منتخب التفاسیر کی تکمیل:۔ لاہور میں یہ بات عام تھی کہ کام کرنے والوں کی ضرورت کا پورا احساس ذمہ داروں کو رہتا تھا، وہ بے جا استحصال نہیں کرتے تھے، اپنے آدمیوں کو حتی الامکان مطمئن کر کے رکھتے تھے، اور اگر اچھا کام مل جاتا اور تنخواہ زیادہ ہوتی تو بڑی فراخدلی اور انشراح سے دوسری جگہ جانے کی ترغیب دیتے تھے، بشرطیکہ ان کے یہاں گنجائش نہ ہو، ’’منتخب التفاسیر‘‘

کا کام پوری طرح میرے قابو میں آ گیا، اور یہ کام میں نے ۱۵/جنوری ۱۹۴۵ء سے یکم /جون ۱۹۴۶ء تک ۱۶/ ماہ کی مدت میں پورا کرلیا۔ اور تقریباً ۹۵۰ (ساڑھے نوسو صفحات، بڑی سائز کے) میں مکمل کر کے اراکین کے حوالہ کردی، میری موجودگی میں اس کی کتابت بھی ہورہی تھی، ساڑھے تیرہ پارہ کی کتابت ہوچکی تھی، خطاط منشی محمد قاسم لدھیانوی کے پوتے اس کی کتابت کررہے تھے، مگر افسوس کی تقسیم ملک کے پُرآشوب ہنگامہ میں یہ تفسیر طباعت واشاعت سے رہ گئی، معلوم نہیں اس کا مسودہ بھی محفوظ ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ابتداء ہی میں مجھے قرآن کریم کی خدمت کی توفیق ملی، اور جوانی کے دور کا یہ پہلا کارنامہ آئندہ میرے حق میں باعثِ خیر وبرکت ہوا، مگر افسوس کی اس کی اشاعت نہیں ہوسکی۔

''منتخب التفاسیر'' کی تدوین وتالیف کے دوران ۲۸/جنوری ۱۹۴۵ء، ۱۸/مئی ، اگست، ۳۰/ستمبر اور جون ۱۹۴۶ء میں پانچ مرتبہ وطن آیا، اس زمانہ میں ریل کا کرایہ شاہ گنج سے لاہور تک ساڑھے بارہ روپیہ تھا، شاہ گنج سوار ہوتا تھا اور لاہور اترتا تھا، اسی طرح لاہور سوار ہوتا تھا اور شاہ گنج اترتا تھا، شام کو لاہور سے چلتا تھا، اور دوسرا دن گذار کر، رات میں دو بجے شاہ گنج اترتا تھا، ایک مرتبہ منشی عبدالرحیم صاحب کے کام سے آیا تھا، انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا کوئی امتحان دیا تھا، جس میں کسی مضمون کا پرچہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے پاس تھا، اسی سلسلہ میں انھوں نے مجھے بھیجا تھا، مگر آنے سے پہلے ہی مولانا نے پرچہ دیکھ کر یونیورسٹی کو بھیج دیا تھا۔

میں ابتداء میں اخبار ''زمزم'' کے دفتر ہی میں رہتا تھا، کھانا پیسہ اخبار کے ایک معمولی ہوٹل میں کھاتا تھا، ماہوار دو وقت کھانے کی قیمت بڑے گوشت کی ۱۳/روپیہ اور چھوٹے گوشت کی ۱۵/روپیہ تھی، میں بروقت قیمت دیا کرتا تھا، لاہور میں چائے اور پان کی دوکانیں بہت کم تھیں، لسی، دودھ، دہی، کلچہ، حلوہ، پراٹھہ اور پھل کی دوکانیں زیادہ تھیں، میں صبح کو ناشتہ میں عام طور سے ایک کلچہ اور ایک گلاس دودھ

استعمال کرتا تھا، پنجابی جسم و جثہ کے اعتبار سے گلاس بھی بڑا ہوتا تھا، غالباً ۴/آنے میں کام چل جاتا تھا، کچھ پیسہ اخبار کے جنوبی حصہ کی ایک گلی کے مکان میں رہا، جس میں بجنور کے مزدور رہا کرتے تھے، اسی میں مولوی مجید حسن مالک مدینہ بجنور کے بھائی مولوی ظہور الحسن بھی رہتے تھے، وہ مدینہ بکڈ پو کے ایجنٹ تھے، اور ہم لوگوں کے گویا سرپرست تھے اور کھانے پکانے میں شریک تھے، سالن کمرے میں پکا لیتے تھے، اور روٹی تندور میں پکوا لیتے تھے، یہاں کا قیام بہت مختصر رہا، اور جلد ہی ''زمزم'' کی طرف سے اندرونِ بھائی گیٹ مبارک منزل میں رہنے لگا، اسی میں مولانا فارقلیط صاحب رہتے تھے، اور بعد میں مرکز تنظیم اہل سنت کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں آ گیا، اور مولانا نور الحسن صاحب بھی یہیں آ گئے۔

__ابوسعید بزمی__ :۔ کچھ دنوں کے بعد سید ابوسعید بزمی صاحب بھی اسی میں آ گئے، وہ پہلے ''زمزم'' میں تھے، بعد میں اخبار ''احسان'' کے اڈیٹر ہو گئے، اس طرح مبارک منزل میں کئی اہل علم یکجا ہو گئے، مولانا فارقلیط اور بزمی صاحب اوپر کے منزلہ پر رہتے تھے، اس زمانہ میں بزمی صاحب جناب احسان دانش کے مشورہ پر ''تاریخ انقلابات عالم'' لکھ رہے تھے، وہ اکثر میرے پاس آتے تھے، اور امیر شکیب ارسلان کی کتاب ''**حاضر العالم الاسلامی**'' کے معانی و مطالب معلوم کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ اس حال میں آ گئے کہ میں اور ایک ساتھی چائے پی رہے تھے، میں کپ میں پی رہا تھا، اور ساتھی کپ نہ ہونے کی وجہ سے لوٹے میں پی رہا تھا، بزمی صاحب نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا! بہت خوب، اب بھی آپ لوگ کبھی کبھی طالب علمی کا لطف اٹھا لیتے ہیں، مبارک منزل کا یہ ایک واقعہ قابل ذکر ہے کہ میں گرمی کی دوپہر میں ہوا کے خیال سے ایک دروازہ کے سامنے چارپائی پر سوتا تھا، تو کسی نہ کسی مردے کا خواب ضرور دیکھتا تھا، اور جب چارپائی وہاں سے ہٹا کر سوتا تھا تو یہ خواب نہیں دیکھتا تھا، آزمانے کے لئے بارہا میں نے ایسا کیا، یہ خواب پریشان کن نہیں ہوتا تھا، مگر یہ واقعہ

ضرور ہوتا تھا، شاید کسی زمانہ میں وہاں کوئی قبر رہی ہو۔

مدرسہ احیاء العلوم میں عارضی مدرسی: ۔شوال ۱۳۶۶ھ تا صفر ۱۳۶۷ھ (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء) پانچ ماہ احیاء العلوم میں عارضی طور پر تدریسی خدمت ۴۵/روپیہ مشاہرہ پر کی، والد صاحبؒ اس سال حج وزیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے، اور میرا گھر پر رہنا ضروری تھا، میں نے ان کے ذریعہ امام عبدالبر کی ''جامع بیان العلم'' اور امام ابوعبید قاسم بن سلاّم کی ''کتاب الاموال'' منگوائی تھی، اس زمانہ میں مولانا عبدالغنی بارہ بنکویؒ صدرالمدرسین تھے، انھوں نے میری زیر تدریس کتابوں میں ''تفسیر بیضاوی'' بھی رکھی، مگر میں نے یہ کہہ کر اس کے پڑھانے سے انکار کردیا کہ میں اس کو پڑھا سکتا ہوں، مگر اس نوعمری میں اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتا ہوں، امہات کتب پڑھانے کے لئے علم کے ساتھ ساتھ حلم و وقار بھی چاہئے۔

روزنامہ ''زمزم'' میں: ۔اسی درمیان مولانا فارقلیط صاحب نے مجھے لکھا کہ جلد آجایئے، سہ روزہ ''زمزم'' کو روزانہ کرنے کا پروگرام بن رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ رہ کر میرا ہاتھ بٹائیں، چنانچہ میں لاہور چلا گیا، اور ۲۸/ جنوری ۱۹۴۷ء سے مولانا مرحوم کی زیر نگرانی بلکہ زیر تربیت صحافت کے میدان میں قدم رکھا، مولانا میری صحافت کے استاذ ہیں، اور اخبار نویسی میں نے ان ہی سے سیکھی ہے، انھوں نے مجھے اپنا نائب بنایا، درمیان میں ان کا آرٹیکل ہوتا تھا، اور دائیں بائیں میرے نوٹ ہوتے تھے، عموماً دو نوٹ سیاسی ہوتے تھے، اور مختصر سا اخلاقی و دینی مضمون ہوتا تھا، وہ زمانہ بڑے بحران کا تھا، ملک کی تقسیم کا مسئلہ چل رہا تھا، مسلم لیگ اور کانگریس میں سخت اختلافات تھے، ملک میں فسادات کا طوفان جاری تھا، اخلاق وانسانیت ختم ہورہی تھی، ان احوال وظروف کی مناسبت سے یہ اخلاقی و دینی مضامین ہوتے تھے، میں ان کو محفوظ کرلیتا تھا، اور بعد میں جب بمبئی گیا تو ''اسلامی نظامِ زندگی'' کے نام سے ان ہی مضامین کا مجموعہ ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں میری کتاب

بنا۔

جس طرح ''منتخب التفاسیر'' کی ترتیب کی ابتداء میں ذہنی پریشانی تھی، اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اسی طرح ابتداء میں صحافت کے میدان میں بھی راستہ نہیں ملتا تھا، مولانا فارقلیط نے اپنے مقابل میرے لئے میز، کرسی اور دیگر ضروریات کا انتظام کرادیا، اور میں بیٹھا سوچتا تھا کہ کیا لکھوں؟ مولانا نے دو چار دن میری طرف سے سیاسی نوٹ لکھ کر شائع کئے، پھر اخبارات کی بعض سرخیوں پر نشان لگا کر کہا کہ اس کو پڑھ کر اس پر اپنی رائے لکھئے، اور اس کے ہر پہلو پر خوب غور کرنے کے بعد رائے ظاہر کیجئے، جہاں تک خیال آتا ہے، میں نے سب سے پہلا نوٹ کانگریسی لیڈر مسٹر عبدالباری بہاری کے قتل پر لکھا تھا، ابتداء میں مولانا میرے نوٹ دیکھ کر کہتے کہ بہت اچھا ہے، مگر اس کو دوبارہ لکھئے، اور اس میں پھر کاٹ چھانٹ کرتا تھا، مولانا اس میں معمولی تبدیلی کرکے اشاعت کے لئے دیدیتے تھے، پھر ایک ہفتہ کے بعد کہا کہ اب مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، مضمون لکھ کر کاتب کے حوالے کردیں۔

<u>مولانا فارقلیط کا مشورہ</u>:۔ صحافت وانشاء کی زبان کے بارے میں مولانا فارقلیط نے مجھے مشورہ دیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابوں کو پڑھنا چاہئے، مگر ان کا انداز اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ان کا اسلوب نگارش ان ہی کا حق ہے، البتہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنا اسلوب پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، عبدالماجد سالک، غلام رسول مہر، نصر اللہ خاں عزیز، ابوالاعلی مودودی اور دوسرے مشاہیر اہل علم اور خود میں، سب نے مولانا آزاد کو پڑھ کر اپنا اپنا طرز اور اسلوب بنایا۔

چونکہ زمانۂ طالب علمی سے مضامین لکھا کرتا تھا، اس لئے صحافتی اسلوب مین زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی، کسی اہم بات پر نوٹ لکھنا ہوتا تو مولانا اس کے بارے میں ہدایت اور مشورہ دیتے تھے، لاہور اور پنجاب کے مسلمان عام طور سے مسلم لیگ کے پر جوش حامی تھے، اور ''زمزم'' نیشنلسٹ اخبار تھا، اس کی پالیسی مسلم لیگ کے خلاف تھی،

اس لئے مولانا فارقلیط بڑی سنجیدگی اور متانت سے لکھتے تھے، وہ نفسیات کے زبردست ماہر عالم تھے، اندازِ تحریر بھی پختہ اور دلآویز تھا، اس کے باوجود کبھی کبھی سخت مخالفت کی صورت ہو جاتی تھی، راستہ چلتے مولانا کو مسلم لیگی پکڑا کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے کہ دفتر میں آؤ تو تفصیلی بات ہو، اسی ہنگامی دور میں ایک مرتبہ میں نے مسٹر محمد علی جناح کے خلاف ایک نوٹ لکھا، جس میں بعض سخت ترین جملے آگئے تھے، جس پر بڑا ہنگامہ ہوا، مولانا نے مجھ سے کہا کہ اس نازک دور میں اس قسم کی تحریر سے بچنا چاہئے، معلوم ہوتا ہے کہ بھنگ کھا کر یہ نوٹ لکھا تھا، اور رات کو کہا کہ جائیے جلدی دروازہ بند کرلیں، شاید کہ سرپھرے حملہ نہ کردیں، ایک مرتبہ مولانا نے ''دریابادی کا فلسفۂ خیر وشر'' کے عنوان سے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں لکھا تھا کہ جن مولانا حسین احمد مدنی کی توہین وتذلیل کی جارہی ہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور مجاہد وبزرگ مولانا حسین احمد مدنی نہیں ہیں، بلکہ یہ تو ان مولانا حسین احمد مدنی کی بات ہے جو سیاست میں کانگریس کے ساتھ ہیں، اور ایسے ویسے ہیں، یہ باتیں انھوں نے اپنے خاص اسلوب تحریر میں لکھی تھیں، اس کا جواب فارقلیط صاحب نے مجھ سے لکھوا کر اخبار میں شائع کیا تھا۔

''اصلاح'' کابل:- ''زمزم'' ایک مذہبی واخلاقی، اور دو سیاسی نوٹ مستقل طور پر لکھتا تھا، اس کے علاوہ کابل کے روزنامہ ''اصلاح'' سے فارسی خبروں کا ترجمہ کرتا تھا، جو بریدِ افغانستان کے عنوان سے شائع ہوتا تھا، اس میں پشتو اور فارسی میں خبریں اور مضامین ہوتے تھے،

علامہ محمد روحی:- علامہ محمد روحی سنکیانگ (چینی ترکستان یا مشرقی ترکستان) کے عربی اور فارسی میں لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ کرتا تھا، ان کے متعدد مضامین کے ترجمے کئے، جن میں روس میں کمیونسٹ حکومت کے مظالم کی، اور مسلمانوں کے ابتلاء کا بیان ہوتا تھا، اس کے علاوہ مستقل مضامین بھی لکھتا تھا، یہ

''نصیحت ہے یا فتنہ انگیزی'' مولانا عبدالماجد صاحب کا ''جدید فلسفۂ خیر وشر'' کے عنوان سے ۷/نومبر ۱۹۴۵ء کے ''زمزم'' میں پورے دو کالم میں ایک مضمون لکھا، اس مضمون میں بڑی تیزی تھی، اور جواب ترکی بہ ترکی تھا۔ ''جزائر شرق الہند کے تاریخی حالات'' کے عنوان سے ایک لمبا چوڑا معلوماتی مضمون ۱۵/نومبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں لکھا، جس کو پڑھ کر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں سماٹرا کے ایک طالب علم محمد صابر نے مجھ کو خط لکھا اور ان معلومات کے بارے میں مزید تحقیق چاہی، انھوں نے اس سے پہلے اس موضوع پر مضمون لکھا تھا، ''غلامی اور ذہنی تسفل''، ''مردان کار کا قافلہ، منزل آزادی میں'' کے عنوان سے دو کالمی مضمون ۲۳/اکتوبر ۱۹۴۵ء کے شمارے میں لکھا، اسی طرح کئی اور مستقل مضامین لکھے جن کو مولانا فارقلیط کی رہنمائی حاصل تھی۔

<u>مولانا آزاد سے ملاقات</u>:- ''منتخب التفاسیر'' کی جمع وترتیب کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لے آئے، اس وقت وہ کانگریس کے صدر تھے، اور ترجمان القرآن جلد دوم کی طباعت کے لئے ''زمزم کمپنی لمیٹڈ'' سے معاملہ کر رہے تھے، ''فلیٹز'' ہوٹل میں قیام تھا، طباعت واشاعت کے معاملات طے کرنے کے لئے مولانا فارقلیط اور منشی عبدالرحیم ان کے یہاں گئے، میں بھی ساتھ تھا۔ ہوٹل کے سامنے بہت بڑا مجمع تھا، مختلف جماعتیں اور ان کے نمائندے اپنے اپنے حقوق ومقاصد کے لئے مولانا آزاد سے بات کرنا چاہتے تھے، ان میں ہجڑوں کا بھی ایک نمائندہ تھا جو اپنی پارٹی کے حقوق کے لئے بات کرنا چاہتا تھا، ہوٹل کا دو تین دروازہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ مولانا کے پاس پہونچے، ہر دروازہ پر سنتری رہتے تھے، مولانا چارپائی پر کھادی کا کرتا پائجامہ پہنے ہوئے، ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے، بڑے تپاک سے ملے، منشی جی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے یہاں ''منتخب التفاسیر'' لکھ رہے ہیں، مولانا نے کہا کہ بہت خوب، اللہ تعالیٰ جزاء خیر دے، ترجمان القرآن کے سلسلے میں کہا کہ پہلا اڈیشن دو ہزار کا ہوگا، اس کا حق تصنیف پندرہ ہزار

روپئے ہوگا، نصف پیشگی ہوگا اور قیمت اتنی ہوگی، دوسرے اڈیشن کے لئے آپ کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابت میرے کاتب منشی عبد القیوم صاحب کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ منشی صاحب نے کہا کہ ہم الہلال کو دوبارہ جاری کرنا چاہتے ہیں، آپ وقتاً فوقتاً مضامین عنایت کر دیا کریں۔ مولانا نے کہا کہ میں اس کا وعدہ تو نہیں کرتا، مصروفیات تو زیادہ ہیں مگر اس کا خیال رکھوں گا۔ بات آئی، گئی، ہوئی، انداز گفتگو انداز تحریر سے ملتا جلتا تھا، ''میرے بھائی'' کا جملہ بار بار دہراتے تھے، یہ مولانا آزاد سے میری پہلی ملاقات تھی، اس کے بعد ایک مرتبہ بمبئی کے تاج ہوٹل میں جمعیۃ علماء کے وفد کے ساتھ ان کے دیدار و گفتار سے استفادہ کا موقع ملا، اور ایک بار جب وہ وزیر تعلیم تھے، رجال السند والہند کے سلسلے میں ان کو خط لکھا تھا، جس کا جواب پروفیسر اجمل نے دیا تھا۔

اسی وقت مولانا آزاد نے ''غبار خاطر'' کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا، عبد المجید سالک اور غلام رسول مہر سیاسی اختلاف کے باوجود مولانا کے پرستاروں می سے تھے، انھوں نے اس کے لئے کاغذ وطباعت وغیرہ کا انتظام کیا، اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے بڑی مشکلات تھیں، میں نے ''غبار خاطر'' کا مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ دیکھا، ہاتھ میں رعشہ کا اثر ظاہر تھا، اور جگہ جگہ نظر ثانی تھی۔

مولانا کے کاتب خاص منشی عبد القیوم صاحب خطاط مرادآبادی دفتر ''زمزم'' میں رہ کر ترجمان القرآن کی کتابت کرتے تھے، وہ کلکتہ مین بھی مولانا کی کتابیں لکھا کرتے تھے، اور مولانا کے واقعات بیان کرتے تھے، دو ایک واقعات درج کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کلکتہ میں بعض اوقات مولانا سخت تنگی میں مبتلا ہو جاتے تھے، حتیٰ کہ بجلی کا کنکشن کاٹ دیتے تھے، اور دو آنے کا باہر سے کباب اور روٹی منگا کر وقت گزار لیتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ترجمان القرآن لکھتے وقت اصحاب کہف کے غار کا جو نقشہ بیان کیا تھا، اس سے مجھے اختلاف ہوا، اور میری سمجھ میں بات

نہیں آئی، میں نے مولانا سے اس کا تذکرہ کر کے ان کو بتایا کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہئے، مولانا کمرے سے باہر صحن میں آئے، اور زمین پر نقشہ بنایا، اور میری بات کی تصدیق کی، اور کتاب میں فوراً ترمیم و تنسیخ کر دی۔ ترجمان القرآن کے مطبوعہ فرمے کی ہم لوگ تصحیح کرتے تھے۔ ۱۶ر صفحے کے ایک فرمے پر ایک روپیہ ملتا تھا، منشی صاحب نے بتایا کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد کی کتابت میں نے کی تھی، جو مدینہ پریس بجنور میں چھپی تھی، اس کے مطبوعہ فرمے مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار مدینہ نے مولانا آزاد کو پڑھنے اور تصحیح کرنے کو بھیجا تو مولانا نے اس مین اس قدر کاٹ چھانٹ اور اس قدر زیادہ اضافہ کر دیا کہ دوبارہ کتابت کرانی پڑی، اس کے بعد مولانا کے پاس نہیں بھیجا، کیونکہ وہ پھر اس میں پہلے کی طرح حک و اضافہ کرتے اور دوبارہ کتابت کرانی پڑتی۔

یہ بات صرف مولانا آزاد ہی کی نہیں ہے، بلکہ ہر مصنف اور مضمون نگار جب اپنی تحریر کو دیکھتا ہے تو اس میں حک و اضافہ کرتا ہے، اسی لئے کاتب اور مصنف میں ان بن رہتی ہے، مصنف اپنی کتاب کو آخری حد تک کامل و مکمل کرنا چاہتا ہے اور کاتب پہلا مسودہ لکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

مولانا فارقلیطؒ:- میں چند دنوں کے بعد لاہور کی ادبی فضا سے مانوس ہو گیا، خاص طور سے وہاں کے شعراء و ادباء اور صحافیوں سے تعلقات ہو گئے، مولانا فارقلیط صاحب بہت کم آمیز آدمی تھے، عربی کے عالم ہونے کے ساتھ انگریزی سے اچھی طرح واقف تھے، ان کو علم النفس (سائکلوجی) سے خاص تعلق تھا، اس فن کی انگریزی کتابیں خریدتے اور خوب پڑھتے تھے، حدیث کی کتاب ریاض الصالحین ہمیشہ مطالعہ میں رکھتے تھے، مسلکاً اہل حدیث تھے، فناً حداد (لوہار) تھے، وطن پلکھوہ ضلع میرٹھ تھا۔ ۱۹۰۱ء کی پیدائش تھی، قیام لاہور کا پورا زمانہ ان ہی کے ساتھ گزرا ہے، اندرونِ بھاٹی گیٹ کی مبارک منزل میں وہ پہلے منزلہ پر بال بچوں کے ساتھ رہتے

تھے، میں نیچے ایک کمرہ میں رہتا تھا، اسی کے پاس مرکز تنظیم اہل سنت کا دفتر بھی آ گیا تھا، دفتر میں میری میز ان کی میز سے متصل ہوتی تھی، ان کے بارے میں مزید باتیں آئندہ لکھوں گا۔

احسان دانشؒ:- ان کے بعد سب سے زیادہ تعلق حضرت احسان دانش سے تھا، زمانۂ طالب علمی میں مراد آباد میں ایک ادبی رسالہ میں ان کی غزل چھپی تھی، جس کا مطلع یہ تھا ؎

احسان وہ دن یاد آتے ہیں جب کیف تھا حاصل جینے میں
آنکھوں میں تبسم رقصاں تھا، ارمان بھرے تھے سینے میں

اس پوری غزل کو میں نے بار بار پڑھا اور اس سے متاثر ہوا، اس کے چند مہینے کے بعد شبلی کالج اعظم گڈھ میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا، جس میں احسان دانش صاحب بھی آئے تھے، میں اسی سال فارغ ہوا تھا، دوستوں کے ساتھ مشاعرہ سننے کے لئے گیا۔ جس میں انھوں نے اپنے خاص ترنم اور مخصوص انداز میں ''جشنِ بیچارگی'' سنائی، جس میں ایک مزدور کی لڑکی، کی رخصتی کا منظر تھا، یہ ان کی خاص نظم تھی، جس کو سامعین کے اصرار پر دوبارہ سنایا، ایک غزل بھی پڑھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

ترے بغیر زندگی درد ہے، زندگی نہیں — پرسش غم کا شکریہ کیا تجھے آگہی نہیں

اس نظم اور غزل کو سن کر ہم لوگوں نے وہیں ان کی دو کتابیں ''نوائے کارگر'' اور ''آتش خاموش'' خریدی، اور لا کر خوب خوب ان کو سنتے سناتے تھے، مناظر قدرت کی عکاسی، تشبیہات، اشارات، کنایات اور تمثیلات ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات تھے، میں ان سے متاثر بلکہ مرعوب تھا، ایک مرتبہ لاہور میں ایک مکتبہ میں ان کو دیکھا مگر تعارف نہ ہونے کی وجہ سے نہ مل سکا،

علامہ انور صابری کے ذریعہ تعارف:- اسی درمیان علامہ انور صابری مرحوم لاہور آئے، ان کا قیام دفتر احرار اسلام میں تھا۔ وہ ہماری طالب علمی کے دور

میں مبارکپور کے سیاسی وقومی اور دینی جلسوں میں آیا کرتے تھے، بعد میں وہ مہینوں مہینوں مبارکپور مدرسے میں پڑے رہتے تھے، اور ہم لوگوں کی محفلیں جمتی تھیں، اخبار ''زمزم'' کی پیشانی پر یہ شعر ان ہی کا تھا۔

جس کے پیتے ہی کھلیں مومن پہ اسرارحیات دین ابراہیم کی وہ مے اسی ''زمزم'' میں ہے

اسی لئے وہ جب بھی لاہور آتے تو ''زمزم'' کے دفتر میں ضرور آتے، جب وہاں پہونچا تو اس مین مزید اضافہ ہوگیا، پہلی بار لاہور میں ملے تو مجھے وہاں کے اکثر شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے ملایا، ایک تانگہ طے کیا اور کئی گھنٹے تک اسی پر لوگوں سے ملتے رہے۔ احسان دانش سے مل کران سے میرا تعارف بڑے شاندار الفاظ میں کرایا، اور یہ کہ یہ شخص عربی کا زبردست عالم ہے۔ عربی سے اردو ترجمہ کرنے مین ماہر ہے، اسی قسم کے جملے کہے، اور احسان صاحب نے مجھ سے کہا کہ استاد ہمارے یہاں آیا کرو، ہمارے یہاں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں۔ وہ سب کو ''استاذ'' کہتے تھے، اور ہم سب ان کو استاد کہتے تھے، اس کے بعد احسان صاحب سے اتنا زیادہ ربط ضبط بڑھا کہ دن میں جب بھی موقع ہوتا ''مزنگ'' گندم منڈی میں ان کے یہاں چلا جاتا تھا، اور یہ معمول تھا کہ رات کو ''مزنگ'' میں احسان صاحب کے یہاں ہم لوگ جمع ہوتے، اور گیارہ بجے وہاں سے واپس آتے، یہ آمدورفت پیدل ہوا کرتی تھی۔

<u>ہم عصر شعراء</u>:۔ یہان ایک مختصر سا حلقہ احباب بھی پیدا ہوگیا تھا، جس میں سب شاعری کرتے تھے، ۔عشرت کرتپوری، اظہار اثر کرتپوری، سردار ہربنس سنگھ باغی، شیو پرساد بہار لکھنوی، ہم پانچ شعراء اکثر ساتھ رہا کرتے تھے۔ اور جب کبھی فرصت ملتی، شعری محفل جم جاتی تھی، عشرت اور اثر انارکلی بازار میں ''کرنال شباب'' جوتے کی دوکان میں ملازم تھے، شیو پرساد بہار لکھنوی، شاہ عالمی گیٹ کے پاس ٹاٹا کمپنی میں ملازم تھا۔ ہم لوگ اکثر ہوٹل میں ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے، ان میں

عشرت کرتپوری سے خاص تعلق تھا، اس میں بڑا اخلوص تھا، کبھی کبھی اتوار کی رات میں میرے یہاں آکر سوجاتا تھا، تقسیم کے بعد ایک مرتبہ مبارکپور بھی آیا تھا۔ اس نے ''کاکل'' کے نام سے صبح بنارس پر نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، جس میں میری بھی ایک نظم ہے، لاہور میں ہم لوگ ایک ساتھ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اور واپسی پر ایک دوسرے کو اس کی قیام گاہ پر پہونچاتے تھے، بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ سب مجھے پہونچانے آتے تھے، اور پھر میں ان کو پہونچانے جاتا۔ اور وہ پھر مجھے پہونچانے آتے تھے، اس طرح رات کا اکثر حصہ حق رفاقت کی نذر ہوجاتا تھا، شیو پرساد بہار کا ایک شعر اب تک یاد ہے ؎

زمانہ بھر کی تکلیفوں سے چھوٹے   قفس بہتر رہا کچھ آشیاں سے

انارکلی بازار، پیسہ اخبار اور موہن لال روڈ سب قریب قریب تھے، انارکلی بازار کے شمالی سرے پر گنپت روڈ میں مکتبہ دانش تھا، جہاں احسان دانش دن میں اکثر آیا کرتے تھے، انھوں نے اسی دکان میں اوپر لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا تھا۔

<u>علامہ تاجور نجیب آبادی</u>:۔ شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی اور مولانا وارث کامل بھی وہاں آیا کرتے تھے، احسان صاحب مولانا وارث کامل سے ''تاریخ مجاہدین اسلام'' مرتب کرا رہے تھے، جن سے میری ملاقات ہر وقت ہوا کرتی تھی، بعد میں وہ ''غنچہ'' بجنور (بچوں کا رسالہ) کے اڈیٹر ہوئے، مولانا تاجور نجیب آبادی، شنکر دیال کالج میں پروفیسر تھے، ان سے یہیں مکتبہ دانش گنپت روڈ میں اکثر ملاقات ہوتی تھی، کبھی کبھی میں، عشرت اور اظہار اثر ان کے مکان پر جایا کرتے تھے، بڑے بے تکلف اور سادہ مزاج عالم، پروفیسر اور شاعر بلکہ استاذ الشعراء تھے، ایک مرتبہ باتوں بات میں کہنے لگے کہ بعض اوقات مشاعروں میں مجھے جھجھک اور مرعوبیت کا احساس ہونے لگتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالعلوم کی روٹی کا اثر ہے، (موصوف دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے)

ظفر ملتانی :۔احسان صاحب بے تکلفی میں اپنے ذوق کے مطابق اپنے مصاحبوں اور دوستوں کا بھی نام تجویز کیا کرتے تھے،بھیم سین ظفر ملتانی ان کے خاص شاگردوں میں تھے،انھوں نے احسان صاحب کے اقوال وآراء کو جمع کر کے شائع کیا تھا، وہ موٹے سیاہ رنگ کے آدمی تھے،احسان صاحب ان کو''اللہ میاں کی بھینس'' کہا کرتے تھے،ظفر بعد میں دہلی آ گئے تھے،احسان پر کچھ لکھ رہے تھے، مجھے بمبئی لکھا کہ کوئی مضمون بھیجئے،مگر جلد مر گئے ، مجھ کو''ہمارا قاضی چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا'' کہتے تھے، عشرت کو'' کابک سے جھانکتا ہوا کبوتر کا بچہ'' سے تشبیہ دیتے تھے، ہم لوگوں نے کبھی احسان صاحب کو شاعری کرتے ہوئے نہیں دیکھا،شاعر مزدور تھے،مزدوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، ان کے پاس کبھی کسی بڑے آدمی کو آتے جاتے نہیں دیکھا، نماز کے سخت پابند تھے،اور بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے،ایک مرتبہ جمعرات کی شام کو مزنگ گیا، احسان صاحب مصلّے پر بیٹھے تھے، سامنے شیرینی تھی ، اور اپنی والدہ مرحومہ کیلئے ایصال ثواب کرر ہے تھے، مجھے بھی ایک عدد شیرینی دی، میں نے لینے سے انکار کیا تو کہا کہ استاد! مولوی الیاس (بانی جماعت تبلیغ،حضرت مولانا محمد الیاس صاحب) میرے چچا ہوتے ہیں، میں فاتحہ اور چادر قوالی والوں میں سے نہیں ہوں، انھوں نے مولانا وارث کامل سے''تاریخ مجاہدین اسلام'' ابوسعید بزمی سے''تاریخ انقلابات عالم'' اور مجھ سے''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' لکھوائی تھیں،جن کا ذکر آئندہ آئے گا،احسان دانش صاحب نے ایک مرتبہ اپنی والدہ کا مرثیہ''گورستان'' پورا پڑھ کر ہم لوگوں کو سنایا تھا،انھوں نے بعض ان بلڈ گوں کو دکھایا،جن میں انھوں نے مزدوری اور گارا مٹی کی تھی، اپنے بچپن کے عجیب عجیب واقعات سناتے تھے،اور لاہور آنے کے بعد کن حالات سے گزرے،اور شعر وادب کی فضا میں کیسے آگے بڑھے، یہ سب باتیں بیان کرتے تھے۔

شاہ عالمی گیٹ آسٹریلیا مسجد کے قریب جنوب میں رسالہ''بیسویں صدی'' کا

دفتر تھا، اس کے پاس ہی مسجد ''یک شبی'' تھی، جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

غازی خاں کابلی:۔ ''بیسویں صدی'' میں غازی خاں کابلی مشہور شاعر ملازم تھے، ان سے ملاقات کیلئے میں اکثر جایا کرتا تھا، وہ بڑے بے تکلف سیاسی شاعر تھے، بعد میں پختونستان کی تحریک میں شریک ہو کر اس کے صدر ہو گئے تھے، اور میرے قیام بمبئی کے زمانہ میں بمبئی میں اس کا اجلاس کیا، جس کا خطبہ صُدارت مجھ سے لکھوایا، اس وقت میں جمعیۃ علماء کے دفتر وزیر بلڈنگ میں رہتا تھا۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ:۔ دفتر احرار اسلام میں اکثر جاتا تھا، اس کے اراکین سے خاص تعلق تھا، حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، جانباز مرزا امرتسری، مولوی مظہر علی اظہر اور علامہ انور صابری وغیرہ، اکثر یہاں جمع ہوتے تھے، ''دفتر احرار'' کے اوپر ایک اور دفتر تھا، جس کے لمبے چوڑے بورڈ پر ''انجمن چار سو بیساں'' لکھا تھا، حضرت شاہ صاحب کی مجلس بڑی پُر کیف ہوتی تھی، بڑی بے تکلفی سے احباب میں گھلے ملے رہتے تھے، اور مزے لے لے کر اشعار سناتے تھے، ایک شعر اب تک یاد ہے، جسے جھوم جھوم کر دیر تک پڑھا کرتے تھے، ؎

سمٹتا ہی رہا دامن کسی کا　　　لپکتا ہی رہا خونِ شہیداں

مولانا احمد علی لاہوریؒ:۔ جمعہ کی نماز اکثر انجمن خدام الدین شیرانوالہ میں پڑھتا تھا، مولانا احمد علی لاہوریؒ سے نیاز حاصل ہوتا تھا، وہاں پہونچ کر اپنا دینی و علمی ماحول ملتا تھا، ان کے صاحبزادے مولانا عبید اللہ صاحب سے بھی تعلق تھا، زمانۂ طالب علمی میں ہم لوگ انجمن خدام الدین کی طرف سے شائع ہونے والے چھوٹے چھوٹے رسالے منگوایا کرتے تھے، اس طرح یہاں سے دینی و علمی تعلق تھا، مولانا احمد علی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر میں پنجابی نہ ہوتا تو یہاں کے لوگ مجھے مار

ڈالتے، کیونکہ حق گوئی و بے باکی میں مشہور تھے، اوران کے مخالفین بہت زیادہ تھے۔

علامہ محمد روحی سنکیا نگ:۔اسی زمانہ میں سنکیا نگ (مشرقی ترکستان) کے ایک عالم علامہ محمد روحی سے ملاقات ہوئی،۱۹۱۲ء مین چین اور روس کے درمیان مشرقی ترکستان (سنکیا نگ) میں وہاں کے مغل نسل کے حنفی مسلمانوں نے جمہوریہ اسلامیہ قائم کی، علامہ عبدالقادر آرنوشی صدر، اور علامہ مبشر طرازی وزیر ہوئے، ان ہی میں علامہ محمد روحی بھی شامل تھے، مگر چند سال کے بعد (غالباً ۱۹۱۷ء) میں چین نے اس پر قبضہ کرلیا، اور یہ حضرات وہاں سے ہجرت کر کے افغانستان چلے آئے، انگریزوں کے اشارے پر شاہ افغانستان نادرشاہ نے ان کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا، اور چودہ سال کے بعد رہائی نصیب ہوئی، مبشر طرازی سعودی عرب، مصر وغیرہ چلے گئے، جن کے صاحبزادے عبداللہ مبشر طرازی ہیں، جو فی الحال سعودی عرب میں جامعة الملک جدہ میں معلم ہیں، اور پاکستان کی تاریخ دو جلدوں میں عربی میں لکھی ہے، اور مجھے ہدیہ کی ہے، ان سے اسلام آباد میں ملاقات ہوئی ہے، وہ روسی، عربی، فارسی اور اردو کے عالم ہیں۔ علامہ محمد روحی لاہور آ گئے، سخت بدحالی و پریشانی میں مبتلا رہتے تھے، روس کی کمیونسٹ حکومت کے مظالم پر عربی اور فارسی میں مضامین لکھتے تھے، اوراس کا ترجمہ کر کے ''زمزم'' میں شائع کرتا تھا، اس کا ان کو مختصر سا معاوضہ ملتا تھا، اکثر دفتر میں آتے تھے، میں نے ان سے روسی اُوَیغُوِی زبان پڑھنی شروع کی، مگر چند اسباق سے آگے نہ بڑھ سکا، پھر معلوم نہیں وہ کہاں تشریف لے گئے۔

نصر اللہ خاں عزیز:۔مولانا فارقلیط صاحب اور ملک نصر اللہ خاں عزیز بی ،اے دونوں کسی زمانہ میں ''مدینہ'' بجنور کے مدیر تھے، ''زمزم'' کے اڈیٹر ملک نصر اللہ خاں عزیز تھے۔ باہمی اختلافات ہوئے تو وہ عبدالمجید سوہدری کے اخبار ''مسلمان'' کے اڈیٹر ہو گئے، اور مولانا فارقلیط ''زمزم'' میں رہے، اور دونوں میں میرے اشعار چھپتے تھے، مولانا فارقلیط، ملک صاحب سے ملنے کیلئے اکثر تھانہ گاول منڈی

جایا کرتے تھے، میں بھی ساتھ ہو جاتا تھا، ملک صاحب بڑے تپاک اور محبت سے ملتے تھے، ایک روز انھوں نے کہا کہ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب مسٹر مذہب کی طرف آتا ہے تو مولوی ملاّ کو ماند کر دیتا ہے، اور جب مولوی ملاّ روشن خیال بنتا ہے تو الحاد و بد دینی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ ملک صاحب کی والدہ قادیانی تھیں، وہ ان کو ماہ بماہ خرچہ دیا کرتے تھے۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی بانی خاکسار تحریک کو ایک مرتبہ پیسہ اخبار میں دیکھا تھا۔ اسی طرح مولانا فارقلیط کے ساتھ ایک مرتبہ لارنس گارڈن (جناح باغ) میں مولانا ظفر علی خاں کو ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت وہ بڑھاپے کی آخری منزل میں تھے۔

مولانا حبیب الرحمٰن:۔ لاہور میں ایک عالم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مولانا سلمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ اللعٰلمین ﷺ'' کے بھتیجے تھے، وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ فیروز پور میں میرا کتب خانہ ہے، وہیں چل کر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری کیا جائے، جھنگ کالج کے پروفیسر خان عبد المجید خان مدظلہ ''جدید آلات جنگ'' اپنی کتاب کی طباعت کے سلسلے میں لاہور آتے، اور دفتر ''زمزم'' میں قیام کرتے تھے، ان سے تعلقات وسیع ہوئے تو انھوں نے بار بار تقاضا کیا کہ آپ انگریزی پڑھ لیں، پڑھنے پڑھانے کا انتظام میں کروں گا، پاس میں کراؤں گا۔ اور اپنے کالج میں ملازمت دلاؤں گا، جناب ابوسعید بزمی کہا کرتے تھے کہ آپ تھوڑی انگریزی زبان حاصل کرلیں تو آپ کی قیمت دوگنا ہوجائے گی، احسان دانش صاحب نے تصنیف و تالیف کے لئے ایک ادارہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ ہم لوگ وہاں اطمینان سے کام کریں۔ اس کیلئے انھوں نے نواب باغپت (غالبًا جمشید علی خاں) کو لکھا، اور انھوں نے اس کے لئے اپنا باغ اور بنگلہ پیش کیا، مگر ان سے کوئی کام نہیں ہوسکا، نیلے گنبد کی مسجد میں مدرسہ اشرفیہ تھا، میں وہاں بھی اکثر جایا کرتا تھا۔

میونسپل لائبریری سے کتابیں:۔ میں لاہور کی میونسپل لائبریری کی فیس

داخل کر کے وہاں سے کتابیں لا کر پڑھتا تھا، اوران سے مضامین نقل کرتا تھا۔اسی سے پہلی بار طبقات الشافعیه الکبریٰ اورتاریخ ابن عساکر پڑھی، اوران دونوں کتابوں کے اقتباسات نقل کئے، جو میری کتاب ''ائمہ اربعہ'' میں کام آئے، اس کتاب میں ان دونوں کے جتنے حوالے ہیں، وہ سب ان ہی اقتباسات سے ہیں، جن کو میں نے محفوظ کر رکھا ہے۔اور طبقات الشافعیه الکبریٰ کو بعد میں خریدا، اس لائبریری سے امام احمد بن حنبلؒ کے حالات میں ایک کتاب مطبوعہ یورپ لے کر پوری کتاب نقل کر لی، غالباً جرمن یا فرنچ زبان میں اسکے تعلیقات وحواشی تھے۔اس کتاب کے مندرجات بھی ''ائمہ اربعہ'' میں آگئے ہیں، مجھے اسی زمانہ میں یہ احساس ہوا کہ امام احمد بن حنبل کے حالات وسوانح پر اردو میں نہ ہونے کے برابر کام ہوا ہے، اس لئے ان کی مفصل سوانح لکھنے کی ضرورت ہے، اعظم گڈھ میں ''سیرۃ النعمان'' اور ''حیات امام مالک'' لکھی گئی ہیں، یہیں سے حیات امام احمد بن حنبل بھی لکھی جانی چاہئے، اور ''افادات امام احمد بن حنبل'' کے نام سے بعد میں ایک کتاب بمبئ میں کتابت کرائی جو کتابت شدہ اب تک میرے پاس محفوظ ہے، نہ وہ شائع ہوسکی اور امام صاحب کی مستقل سیرت لکھ سکا، البتہ ''ائمہ اربعہ'' میں ان کے مختصر حالات آگئے ہیں۔

<u>خریداریٔ کتب</u>:۔اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق کتابیں خریدتا تھا، اور جمع کرتا تھا، انارکلی بازار سے اتوار کے دن پرانی کتابوں کے ڈھیر سے ''الامعان فی اقسام القرآن'' لابن قیم اور ''الصراع بین العلم والدین'' خریدی، یہ کتاب غالباً ڈریپر کی انگریزی کتاب کا عربی میں ترجمہ تھا، جس کا اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے ''معرکہ سائنس ومذہب'' کے نام سے کیا، اور میں نے فراغت کے بعد لکھنؤ کے نخاس بازار سے خریدا تھا، ''الامعان'' بعد میں مولانا عبدالحفیظ بلیاوی نے مطالعہ کے لئے طلب کی، اور میں نے ان کو دے کر واپس نہیں لی، اور ''الصراع بین العلم والدین'' کہیں کرم خوردہ پڑی ہے، (رجب ۱۳۶۵ھ ۔ ۱۹۴۵ء) میں ابن بحتری کا دیوان

''الحماسہ'' مطبوعہ حیدرآباد خریدا، اس سے پہلے شعبان ۱۳۶۴ھ میں ''تہذیب التہذیب'' لابن حجر جو بارہ جلدوں میں حیدرآباد میں چھپی تھی، اس وقت اس کی قیمت تیس روپیہ تھی، کشمیر کی تاریخ اعظمی اور شیخ علی ہجویری کی ''کشف المحجوب'' بھی خریدی، اس وقت ''منتخب التفاسیر'' جمع کر رہا تھا، ''تہذیب التہذیب'' کی ایک جلد زمانۂ طالب علمی میں ''قائد'' مرادآباد میں ''ائمہ اربعہ'' پر مضمون لکھنے کے دوران مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوریؒ کے کتب خانہ سے عاریتاً لے کر استفادہ کیا تھا، اسی زمانہ سے اس کے خریدنے کا شوق تھا، قیمت بھی غالباً ۱۲/ روپیہ تھی، مگر اس کی باری لاہور جانے کے بعد آئی، اور اس کتاب سے میں نے اپنی تصانیف میں خوب خوب استفادہ کیا۔

مولانا فارقلیط صاحب مجھ کو کتابیں لکھنے کی بار بار تاکید کرتے تھے، اور میں کہتا تھا کہ ذرا فرصت ملے تو اس کی طرف توجہ دوں، ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ اگر آپ فرصت کے انتظار میں رہیں گے تو کبھی فرصت نہیں ملے گی، کاموں کے ہجوم میں کام ہوتے ہیں، اور انھوں نے یورپ کے ایک مصنف کا واقعہ بیان کیا جو بہت معمولی زندگی بسر کرتا تھا، اور مزدوری پر اس کی بسر اوقات ہوتی تھی، اس کے باوجود وہ رات کو لکڑی کے صندوق پر چراغ رکھ کر کچھ لکھا کرتا تھا، اس طرح اس نے ایک ناول تیار کی، اور پبلشروں کے پاس لے گیا، مگر جس نے دیکھا مذاق اڑایا، اور مسودہ واپس کر دیا، ایک پبلشر نے اس پر رحم کھا کر اس کا ناول چھاپ دیا تو وہ اس قدر مقبول ہوا کہ کئی ایڈیشن شائع کرنے پڑے، اس کے بعد اس آدمی کی قدر و قیمت اتنی بڑھ گئی کہ وہ مشہور ناول نگار تسلیم کیا گیا۔

الصّالحات:۔ اِدھر احسان صاحب، ابوسعید بزمی، مولانا وارث کامل، اور مجھ کو کتابیں لکھنے پر ابھار رہے تھے، چنانچہ میں نے اس کی طرف توجہ کی، ابتداء میں ایک چھوٹا سا رسالہ ''الصّالحات'' کے نام سے لکھا، جس میں صحابیات رضی اللہ عنہن

کے چھوٹے چھوٹے واقعات جمع کئے، اور اس کو اشاعت کے لئے محمد عارف مالک ملک دین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار لاہور کو دیا، انھوں نے پچاس روپیہ میں گویا یہ رسالہ مجھ سے خرید لیا، اور ایک تحریر لکھوائی، زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ اپنی پہلی کتاب پر رائلٹی یا قیمت ملی، اور وہ کتاب غالبًا چھپ نہ سکی، اس کے بعد میں نے اپنی علمی کاوش کو فروخت نہیں کیا، وہ تحریر یہ ہے،

باعثِ تحریر ایں کہ

مبلغ پچاس روپئے نصف جس کے پچیس روپئے ہوتے ہیں، بابتِ حقِ تصنیف وطباعت دائمی مسودہ کتاب ''الصّالحات'' جو میرا تصنیف کردہ ہے، فرم ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور سے وصول پائے، اقرار ہے کہ میں اس مسودہ کو نہ خود طبع کروں گا، اور نہ اس کے طبع کرنے کی کسی پبلشر یا تاجر کتب کو اجازت دوں گا۔ لہٰذا یہ رسید لکھ دی تاکہ سند رہے۔ قاضی

اطہر مبارکپوری ''مدیر اخبار زمزم'' لاہور، ۱۴ر فروری ۱۹۴۷ء

علمائے اسلام کی خونیں داستانیں:۔ احسان دانش صاحب کے اصرار ومشورہ پر ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' لکھی، جو پہلی صدی ہجری سے موجودہ دور تک اسلامی تحریکوں اور ان میں علماء پر ہونے والے مصائب کو بیان کیا تھا، پہلے ہر صدی میں پیدا ہونے والی تحریکوں اور فتنوں کا اجمالی ذکر تھا، اس کے بعد ان علماء کے کردار اور ان پر ہونے والے مظالم کی تفصیل تھی، یہ کتاب میں نے بڑے اہتمام سے مرتب کی تھی، اور احسان صاحب بھی بڑے اہتمام سے اس کی عبارت وغیرہ درست کرتے تھے، پورا مسودہ ان کی نظر سے گذرا تھا، اور زبان وبیان کی درستگی کی تھی، اس کی اشاعت کا انتظام انھوں نے خود کیا تھا، اس سلسلہ میں ہمارے مابین یہ تحریر ایک روپیہ کے کاغذ پر لکھی گئی۔

معاہدہ بابت علمائے اسلام کی خونیں داستانیں

قاضی اطہر مبارکپوری ولد حاجی محمد حسن صاحب ساکن مبارکپور ضلع اعظم گڈھ حال وارد لاہور کا ہوں، اور اپنی کتاب ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' کا مسودہ جناب احسان دانش صاحب منیجر دانش گاہ پنجاب مزنگ لاہور کو مندرجہ ذیل شرائط پر ایک ایڈیشن کے اختتام تک حقوق منتقل کررہا ہوں۔

۱۔۔۔حق تصنیف کے طور پر کتاب چھپنے کے بعد تین سو جلدیں مجھے دی جائیں گی۔

۲۔۔۔یہ ایڈیشن دو ہزار کا ہوگا۔

۳۔۔۔دوسرے ایڈیشن کیلئے احسان دانش صاحب کو ترجیح دی جائے گی۔

العبد، قاضی اطہر مبارکپوری

اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ ''زمزم'' لاہور۔۱۱/اپریل ۱۹۴۷ء

اس کتاب کے انجام کی داستان خود احسان صاحب اپنی کتاب ''جہانِ دانش'' (خودنوشت سوانح) کے ص:۲۶۷ پر یوں درج کی ہے:

اول سے میری آرزو تھی کہ کسی طرح ایک معیاری قسم کا تصنیفی وتالیفی ادارہ قائم کیا جائے، جس میں ادب عالیہ کی اشاعت ہو، اور موقع کی بنا پر اس کا آغاز بھی کر چکا تھا، لیکن جو میں چاہتا تھا، وہ ڈول نہیں پڑ سکا، اس کے باوجود میں نے ابوسعید بزمی سے دو جلدوں میں ''تاریخ انقلابات عالم'' لکھوائی، اور مولانا وارث کامل سے تین جلدوں میں ''تاریخ مجاہدین اسلام'' مرتب کرائی، اور اس کے بعد قاضی اطہر مبارکپوری سے ''علمائے اسلام کی خونیں داستانیں'' مکمل کرائی۔

اس کے بعد احسان صاحب لکھتے ہیں:

''**تاریخ انقلابات عالم**'' یہ کتاب شیخ نیاز احمد صاحب کو پریس ہی

سے اونے پونے اٹھوادتھی، ’’تاریخ مجاہدین اسلام‘‘ بقدر معاوضہ رسیدیں دیکھ کر آغا شورش کاشمیری لے گئے، ’’علمائے اسلام کی خونیں داستانیں‘‘ اسّی صفحات کم ہونے کے باعث ہنوز کتابت شدہ میرے پاس موجود ہے‘‘

تقریباً ساڑھے چارسو صفحات تک اس کی کتابت ہوچکی تھی، میں نے مسودہ کا معتد بہ حصہ احسان صاحب کے پاس رکھ دیا، پھر باقی حصہ اس خیال سے لے کر وطن چل دیا کہ واپسی کے بعد باقی حصہ دے دوں گا، مگر تقسیم ملک کا وہ طوفان اٹھا کہ میں نہ لاہور جاسکا اور نہ مسودہ روانہ کرسکا، یہ حصہ آج تک میرے پاس محفوظ ہے، ایک مرتبہ احسان صاحب ایک مشاعرہ میں بمبئ آئے اور کئی روز تک رہے، بار بار میں ان سے ملتا تھا اور وہ میرے کمرے میں آتے تھے جب اس کی کتابت کی بات نکلی تو کہا کہ کتابت شدہ کاپیاں میرے پاس محفوظ ہیں، ان کو ڈاک سے نہیں بھیجا جاسکتا ہے، مرحوم نے ’’تاریخ انقلابات عالم‘‘ اور ’’علمائے اسلام کی خونیں داستانیں‘‘ اور بعض دوسری کتابوں کے اشتہار دو ورقہ پمفلٹ پر بلاک بنوا کر بڑے اہتمام سے چھاپا تھا اور ان کتابوں کی خوب خوب تشہیر کی تھی، میری کتاب کا اشتہار پورے صفحہ پر یہ تھا،

’’علمائے اسلام کی خونیں داستانیں‘‘

از:۔قاضی اطہر مبارکپوری

تاریخ ورجال کی صدہا نادر ونایاب کتابوں کا نچوڑ، اس صدی کے اسلامی اور سیاسی لٹریچر میں غیر فانی شاہکار کا اضافہ، آغاز اسلام سے لے کر موجودہ دور تک تاریخ کے خونیں اوراق کا البم، ہر صدی کی ابتداء میں فتنوں اور تحریکوں کا تجزیہ، اور علماء کے مختصر حالات واہم واقعات جو تاریخ میں ہمیشہ تابان ودرخشاں رہیں گے، جابر بادشاہوں، ظالم امیروں، ضمیر فروش پیشواؤں اور جاہل عوام کے ناروا سلوک اور سفاکیوں کی جیتی جاگتی تصویریں، قیدخانوں کی گہری تاریکیوں، طوق وزنجیر کی مہیب

جھنکاروں، دارورسن کی جانگداز گرفتوں، اور درّوں کی دردناک آوازوں میں صداقت کی مسکراہٹ، بے گناہوں کی سینہ سپری، حق گوئی و بے باکی اور سچے مسلمانوں کی عزیمت کے بولتے چالتے خاکے، قیمت: پانچ روپئے مجلد: چھ روپئے

"منتخب التفاسیر" اور "علمائے اسلام کی خونیں داستانیں" آزادیٔ ہند کی نذر:۔ افسوس کہ میری نوعمری کی دینی و علمی کاوش کے دونوں عظیم اور یادگار شاہکار "منتخب التفاسیر" اور علمائے اسلام کی خونیں داستانیں منصۂ شہود پر نہ آسکے اور نہ ہی ایسی کوئی امید ہی ہے

ائمہ ء اربعہ:۔ ایک اور کتاب ائمہ ء اربعہ کے نام سے لکھی، جس کی بنیاد رسالہ قائد مرادآباد زمانہء طالب علمی میں پڑی تھی، مرکز تنظیم اہل سنت نے اس کی کتابت کرائی اس درمیان میں ملک تقسیم ہوا میں اس سے پہلے وطن آ گیا تھا، کتابت شدہ کاپی میرے پاس مبارک پور ڈاک سے آئی، اس وقت ملک تقسیم ہوئے ہفتہ دو ہفتہ گذرا تھا اور پورا ملک خون اور آگ میں جل رہا تھا میں نے اس حالت میں رجسٹری کے ذریعہ تصحیح کے بعد روانہ کی جس کا آج تک پتہ نہیں چلا کہ پہونچی بھی یا نہیں، اس کی اصل میرے پاس تھی، بمبئی گیا تو سلطان پریس بھنڈی بازار کو دیا، اس کے مالک سلطان احمد مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) چلے گئے اور اس کا پتہ نہ چلا، بعد میں اس کی تلافی ائمہ اربعہ لکھ کر کیا جس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۴۰۹ھ ۱۹۸۹ء میں شائع کیا،

مولانا فارقلیط مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ کی معلومات زیادہ ہیں خاص طور سے تاریخی مطالعہ زیادہ ہے، معتزلہ کی ایک تاریخ مرتب کردیں، مولانا چونکہ ابتدا میں آریوں، عیسائیوں سے مناظرہ کرتے تھے اور ان کو اس سلسلے میں نقلی سے زیادہ عقلی استدلال سے کام لینا پڑتا تھا اس لئے وہ معتزلہ کے معقولی طرز استدلال سے متاثر تھے اور کہتے تھے کہ معتزلہ نے اسلام کی طرف سے دفاع میں گراں قدر خدمات انجام

دی ہیں، اس لئے مجھ سے اس کی فرمائش کرتے تھے، مگر اس لئے آمادہ نہیں ہوا اور کہا کہ علامہ شبلی نے آخر عمر میں الکلام اور علم الکلام لکھ کر مورد الزام بنے، میں نو عمری ہی میں ملزم بننا نہیں چاہتا تھا، اور بعد کے دوران قیام میں ان مستقل کتابوں کے علاوہ میں نے کچھ مضوعات پر مسودے کی صورت میں معلومات جمع کی تھیں جواب تک میرے پاس موجود ہیں، مثلاً

طب عربی:۔ الطبابة عن العرب (عربوں کا علم طب) اس موضوع پر اچھی خاصی معلومات جمع کیں، مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ تھا اور اس کا بیشتر حصہ ''عرب و ہند کے طبی تعلقات'' کے عنوان سے جناب مالک رام کی فرمائش پر ایک مضمون لکھا جو ان کی تالیف ''نذر حمید'' (حکیم عبد الحمید ہمدرد دہلی والے) میں چھپا صفحہ ۴۳۹ سے صفحہ ۴۵۱ تک، اور کسی نہ کسی حد تک یہ محنت کام آ گئی،

کتب اور کتب خانے:۔ ''کتب اور کتب خانے'' کے عنوان سے کافی معلومات جمع کیں۔

حیات امام احمد بن حنبل:۔ اس موضوع پر بہت زیادہ معلومات یکجا کر لی تھیں، تاریخ ابن عساکر اور طبقات الشافعیہ الکبریٰ سے کافی مواد نقل کیا، اور میونسپل لائبریری سے امام صاحب پر عربی میں ایک نقل حاصل کی جو مطبع بریل میں ۱۸۹۷ء میں چھپی تھی اور انگریزی یا فرنچ یا جرمنی زبان میں اس کے حواشی وغیرہ تھے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوسکا، گویا وہ پوری کتاب نقل کر لی، اور یہ سب ابتک میرے پاس موجود ہے بلکہ ائمہ اربعہ کی تالیف میں ان سے بہت زیادہ مدد ملی۔

حیات لیث بن سعد:۔ پر کافی معلومات جمع کیں اس کا اصل ماخذ حافظ ابن حجر کی کتاب ''الرحمة الغيثية في الترجمة الليثية'' مطبوعہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ تھی، اس مسودہ کے حاشیہ پر میں نے لکھا ہے اور ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ (۳ مارچ ۱۹۴۷ء) سے جبکہ لاہور میں گولی چل رہی ہے اپنے

کمرے میں بیٹھکر اس امام جلیل کا تذکرہ مرتب کرر ہا ہوں ۔قاضی اطہر مبارک پوری نائب مدیر ''زمزم'' لاہور، (مسودہ میں تاریخ ۵ مارچ ۱۹۴۷ء درج ہے) اس وقت لاہور میں نہایت شدید قسم کا ہندو مسلم فساد برپا ہو گیا تھا اور کئی دن تک قدیم شہر کا شمال مشرقی حصہ قتل وغارت اور آتش زنی کی آماجگاہ بنا رہا ، اس وقت صرف روزنامہ ''زمزم'' کسی طرح چھپتا تھا کیونکہ بھاٹی گیٹ کا علاقہ نسبۃً محفوظ تھا ، میں ''زمزم'' میں اتحاد واتفاق کیلئے قطعات لکھتا تھا،

اقوال حکماء:۔ کے عنوان سے قرآن وحدیث، ائمہء دین، حکماء ، سلاطین، ادباء کے اقوال جمع کئے خاصے کی چیز بن گئی تھی، لاہور علم وادب کا مرکز تھا، ادباء وشعراء اور مصنفوں اور صحافیوں کی چھل پہل تھی معمولی قسم کے شاعر وادیب ہوٹلوں میں شعروشاعری اور چائے نوشی کیا کرتے تھے، جہاں چار ادیب وشاعر بیٹھے کوئی نہ کوئی ادبی پروگرام بن گیا، اور فوراً اس پر عمل بھی ہونے لگا، مصنف تیار، کاتب تیار اور کام چالو، مصنف روزانہ لکھ کر کاتب کو دیتا اور دوسرے دن پھر یہی ہوتا اور ماہ دو ماہ میں کتاب مارکیٹ میں آجاتی، ایک مرتبہ احسان دانش کی مجلس میں بات آئی کہ اس موضوع پر ایک دلچسپ کتاب ہوسکتی ہے، اور یہ میرے ذمہ کر دیا گیا ، نئے نئے موضوعات سوچ کر نکالے جاتے تھے، منشی عبدالرحیم صاحب نے ایک موضوع یہ رکھا کہ لاہور میں جتنے قبرستان ہیں ، ان کے کتبات نقل کر کے ایک بہترین معلوماتی کتاب تیار ہوسکتی ہے، یہ میرے بس کا نہیں تھا، اور اب بہت بعد میں بعینہٖ یہی کام ڈاکٹر محمد اسلم پروفیسر تاریخ پنجاب لاہور نے الواح الصنادید کے نام سے کیا اور کئی قسطوں میں رسالہ برہان دہلی میں شائع کیا، غالباً کتاب تیار ہوگئی ہوگی،

مشکلات القرآن اور کلماتِ اکابر کی اشاعت:۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی کتاب مشکلات القرآن میرے توسط سے احسان دانش صاحب نے اپنے مکتبہ سے شائع کیا، مولانا محمد اسحاق بنارسی کی کتاب حکمات اکابر بھی میرے توسط سے

لاہور میں پہلی بار چھپی، احسان دانش صاحب نے اپنے کاغذ کے کوٹے سے کاغذ دیا اور اپنی نگرانی میں کتابت کرائی، اس سلسلے میں مولانا محمد اسحاق صاحب مہینوں ہمارے ساتھ مبارک منزل میں رہے اور مولانا فارقلیط صاحب کے ساتھ خوب محفلیں جمتی تھیں،

اسیر ادروی اور پرواز اصلاحی:۔ میرے محترم دوست مولانا نظام الدین صاحب اسیر ادروی بھی چند ماہ لاہور میں ہمارے ساتھ رہے، مگر بیماری کی وجہ سے واپس چلے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کو میں نے لاہور بلایا اور احسان دانش صاحب کی یہاں رہ کر انھوں نے مومن دہلوی پر ایک کتاب لکھی جو بعد میں چھپی اور ان کا نام کتاب کے اندر آیا۔

مولوی محمد عثمان ساحر مبارکپوری:۔ میرے دوست مولوی محمد عثمان صاحب بھی چند ماہ لاہور میں رہے، وہ مرادآباد میں بھی میرے ساتھ رہے، وہ ایک سال پہلے فارغ ہو چکے تھے، یہ باہمی انس و محبت کی بات تھی۔

مولانا بشیر احمدؒ و مولانا شمس الدین:۔ ایک مرتبہ مولانا بشیر احمد صاحبؒ و مولانا شمس الدین صاحب بھی میرے یہاں آئے اور چند دن رہ کر واپس ہوئے، ایک شاگرد بھی میرے ساتھ رہا۔

والد صاحب لاہور میں:۔ ایک مرتبہ والد صاحب مرحوم اور محلّہ کے دو اور شخص اچانک لاہور پہونچ گئے، رات کو دفتر سے ایک ملازم ساتھ لے کر مبارک منزل میں آئے، ان کا یہ سفر امرتسر سے ریشم خریدنے کے لئے تھا، کئی دن رہے اور میرے ساتھ امرتسر آتے جاتے رہے، بڑے والد حاجی اسد اللہ، حاجی محمد حسین اور چچا حاجی محمد عمر اور قصبہ کے دیگر حجاج کراچی سے حج کو جا رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، لاہور میں اترے اور سب لوگ میرے یہاں آئے، اور دوسرے روز کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔

وطن کے لوگ:۔ اس طرح جب کوئی شخص کسی جگہ جاتا ہے اور کچھ دنوں رہتا ہے تو اس کے متعلقین اور علاقہ کے لوگ کسی بہانے سے وہاں پہونچتے ہیں اور وہ ذریعہ بنتا ہے، اس زمانہ میں لاہور میں بجنور اور مغربی یوپی کے لوگ نسبۃً زیادہ رہتے تھے، مشرقی یوپی کے لوگ خال خال نظر آتے تھے، جن سے مل ک بڑی خوشی ہوتی تھی، وہ بھی خوش ہوتے تھے، اپنے علاقہ کا کوئی دیہاتی مل جاتا اور میں اس سے وطن پوچھتا تو وہ پہلے گھبراتا تھا اور مجھ سے پوچھتا تھا جب اعظم گڈھ بتاتا تو پھر محلّہ کا آدمی بن جاتا تھا، انسان جب اپنے محلّہ سے باہر جاتا ہے تو محلّہ والوں کو پاکر خوش ہوتا ہے، جب دوسرے شہر میں جاتا ہے تو اپنے شہر والوں کو پاکر مسرور ہوتا ہے، اور جب دوسرے ملک میں جاتا ہے تو اپنے ملک والوں سے مل کر مسرت محسوس کرتا ہے، یہ فطری جذبہ ہے۔

لدھیانہ:۔ قیامِ لاہور کے زمانہ میں پنجاب کے دوسرے علاقوں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ ایک مرتبہ اپنے یہاں کے ایک صاحب کیلئے ہوزری کا سامان خریدنے اور بھیجوانے کیلئے لدھیانہ گیا اور کئی دن مقیم رہا، یہاں بھی بجنور کے لوگ بہت زیادہ تھے اور ان ہی کے یہاں میرا قیام تھا، کبھی کبھی میرے دوست مولوی محمد عثمان صاحب اور میں ٹہلتے ٹہلتے شہر کے باہر شاہدرہ جایا کرتے تھے جہاں جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ ہے، ایک روز ہم دونوں وہیں ایک باغ میں لیٹے ہوئے تھے، میں نے مولوی عثمان سے کہا کہ آج ہم دونوں پنجاب کے اس جگہ ہیں، معلوم نہیں زندگی میں پھر یہاں اس طرح یکجا ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اب ایسا ہوا کہ شاہدرہ تو کیا لاہور جانا مشکل ہے، اس درمیان میں ایک مرتبہ مولانا فارقلیط کی موجودگی میں لاہور جاتے ہوئے ان کے گھر پلکھوہ میں دو دن قیام رہا،

حضرت داتا گنج کے دربار میں:۔ کبھی کبھی جمعرات کو حضرت داتا گنج کے دربار میں جاتا تھا، مغرب اور عشاء کے درمیان جمعرات کو نعت خوانی کی محفل ہوتی

تھی، اردو، فارسی اور پنجابی میں نعتیں اور مذہبی اشعار خوش الحانی سے پڑھے جاتے تھے، محفل میں ایک شخص کھڑا ہو کر اشعار سناتا اور اسی کے بعد ہی فوراً دوسرا شخص کھڑا ہو جاتا۔

شاہی مسجد لاہور:۔ شاہی مسجد لاہور میں نماز پڑھنے کے لئے جایا کرتا تھا اس وقت اس کے مینارے بنائے جا رہے تھے اور حکومتِ پنجاب کی جانب سے اس کا انتظام تھا، پتھر افغانستان سے آتے تھے، لاہور کے بعض لوگوں نے بتایا کہ بڑے بوڑھے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے جبکہ لاہور کی شاہی مسجد کے صحن میں سکھوں کے گھوڑے بندھے رہتے تھے اور کمروں میں ان کے لوگ رہتے تھے، اسی کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بارہ دری تھی، اس کے بعد شاہی قلعہ تھا کبھی کبھی شاہی قلعہ میں جانا ہوتا تھا۔

پکنک:۔ لاہور کے صحافی برسات میں پکنک (سیر و تفریح) کے لئے اجتماعی طور سے شاہدرہ جاتے تھے جن میں اخبارات کے مالک اور مدیر اور دوسرے متعلقین ہوتے تھے، اس میں خاص طور سے آم کھانے اور دودھ پینے کا اہتمام ہوتا تھا، یہ مشغلہ دن بھر رہتا تھا، ایک مرتبہ میں نے ابوسعید بزمی سے کہا کہ چلئے جہانگیر کے مقبرہ کی سیر کریں جو سامنے ہی تھا تو انھوں نے برجستہ کہا کہ آپ جایئے، میں نہیں جاؤں گا، بادشاہوں نے مقبروں کے علاوہ ہمارے لئے کیا چھوڑا ہے، ہم کب تک ان کی مجاوری کریں گے؟

روزنامہ ''زمزم'' کی نائب اڈیٹری:۔ روزنامہ ''زمزم'' میں ۱۷ر جنوری ۱۹۴۷ء سے نائب ڈیٹر کی حیثیت سے مولانا فارقلیط کی زیرنگرانی کام کرتا رہا، اس درمیان میں ملک کی تقسیم کی شرائط اور تفصیلات طے ہو رہی تھیں، پورا ملک ہیجانی دور سے گزر رہا تھا، فارقلیط صاحب کہتے تھے کہ امرتسر اور لاہور میں لڑائی ہوگی اس لئے ہم لوگوں کو اس سے پہلے لاہور چھوڑ دینا چاہئے بعد میں جب سکون ہوگا تو آجائیں

گے، کیونکہ اس طرح کی تقسیم کا وہم وگمان بھی نہیں تھا جس طرح ہوئی، ابوسعید بزمی نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہیں رہنا ہے، وہ اخبار ''احسان'' کے اڈیٹر تھے، وہ کہتے تھے کہ ہندوستان میں تقسیم کے بعد مسلمانوں پر بڑی آفت آئے گی۔

۱۰؍جون ۱۹۴۷ء کو وطن واپسی:۔ میں ۱۰؍جون ۱۹۴۷ء کو وطن پہونچ گیا اور میرے بعد مولانا فارقلیط بھی آ گئے، پھر ہم میں سے کوئی لاہور نہ جا سکا، ان کی آمد کی اطلاع اخبار ''الجمعیۃ'' کے ذریعہ ہوئی، معلوم نہیں ''زمزم'' کے دوسرے اراکین کہاں رہے اور ان پر کیا گذری۔

احسان دانش کا خط اور مولانا سید نور الحسن کا خط:۔ کچھ دنوں کے بعد احسان دانش نے مجھے لکھا کہ یہاں ''ادارہ ثقافتِ اسلامیہ'' سرکاری زیر انتظام قائم ہوا ہے، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس کے صدر ہیں اور میرے ایک شاگرد اس کے خاص رکن ہیں، آپ ایک درخواست اس پتہ پر بھیج دیں جس میں اپنی صلاحیتوں کا بے تکلف اظہار کر دیں، اور مجھے اطلاع دیں، میں کوشش کر کے اس میں رکھوا دوں گا، اور مولانا سید نور الحسن صاحب بخاری نے خیریت معلوم کرتے ہوئے لکھا کہ آپ ہندوستان میں رہیں، وہاں بھی اہل علم کی ضرورت ہے۔

جامع مسجد (مبارکپور) کیلئے کتبے:۔ جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں اب تک کام ہو رہا تھا، میں نے لاہور میں عبدالرشید ایوب الرقم سے معوذ تین کے تین کتبے غالباً بیس بیس روپئے میں لکھوائے، جو جامع مسجد کے محراب کے اندر کندہ حروف میں موجود ہیں۔

عہدِ رفتہ کی جستجو:۔ ۱۰؍مئی ۱۹۷۸ء کو بلادِ عرب وافریقہ کے سفر سے واپسی پر کراچی ہوتا ہوا لاہور پہونچا، مگر میرے زمانہ کا لاہور نہیں ملا، حالانکہ پیسہ اخبار انارکلی میں قیام رہا، اسی طرح مارچ ۱۹۸۴ء میں پاکستان کے سرکاری سفر میں پورے پاکستان کی سرکاری سطح پر سیر کرتے ہوئے لاہور گیا اور گیسٹ ہاؤس میں دو دن قیام رہا

مگر اخبار ''زمزم'' کے دفتر کی بلڈنگ نہیں پا سکا، مگر معلوم ہوا کہ وہ بلڈنگ اب تک اسی جگہ موجود ہے۔

............☆☆☆☆☆............

اخبار ''انصار'' بہرائچ

قیامِ لاہور کا پورا دور ملک میں سخت انتشار، بے چینی اور فتنہ وفساد سے پُر تھا، ملک کی تقسیم طے ہو چکی تھی، تفصیلات طے ہو رہی تھیں، بلکہ ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی، مولانا فارقلیط نے کہا کہ تقسیم کے وقت امرتسر اور لاہور میں فسادات کا خطرہ ہے، اس لئے ہم لوگوں کو یہاں سے وطن چلا جانا چاہئے، جب سکون ہوگا تو واپس آجائیں گے، ان کو اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم ملک اس طرح ہو جائے گی کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، چنانچہ پہلے میں چلا آیا، بعد میں فارقلیط صاحب بھی آگئے، اس کے بعد وہ اخبار الجمعیۃ سے منسلک ہو گئے اور میں بیکار رہا، جگہ کی تلاش میں مدرسوں کا چکر کاٹا مگر کہیں کام نہیں چلا، اسی میں چار پانچ مہینے گذر گئے، سخت پریشانی تھی، مدرسے والے کہتے تھے کہ وہ باہر رہ چکے ہیں اس لئے جب بھی موقع پائیں گے پڑھانا چھوڑ دیں گے۔

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی: ۔اس دور میں مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مبارکپور آئے، وہ یوپی کی پہلی کانگریسی حکومت کے پارلیمنٹری سکریٹری بنائے گئے، انھوں نے اپنے وطن بہرائچ سے ہفتہ وار ''الانصار'' جاری کرنے کا پروگرام بنایا تھا اسکی ادارت کے لئے بات طے ہوگئی، مشاہرہ ۷۵ روپے طے ہوا، قیام وطعام کا انتظام ان کے گھر تھا، اور محرم ۱۳۶۷ھ (نومبر ۱۹۴۷) تا رجب ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸) بہرائچ میں قیام رہا، اکلیل پریس اور کاتب ان کے گھر کے تھے،

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ: ۔مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ اس

وقت مدرسہ نور العلوم میں مدرس تھے، جس کے ذمہ دار مولانا محفوظ الرحمٰن نامی صاحب تھے، وہ نائب اڈیٹر بنائے گئے، ان کا قیام بھی مولانا نامی کے مکان کے ایک حصہ میں تھا، وہ خالص علمی آدمی تھے، اس وقت ''مصباح اللغات'' کے مسوّدات صاف کر کے ''ندوۃ المصنفین'' دہلی بھیجا کرتے تھے، بڑے چاق چوبند، بے تکلف، مخلص اور علمی مزاج کے ہم ذوق آدمی تھے، ان سے خوب بنتی تھی۔

یہ زمانہ پورے شمالی ھند خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کے حق میں بڑا پرآشوب تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے مسلمانون کا نام ونشان مٹا دیا جائے گا، قتل وغارت گری، آتش زنی اور دوسرے طرح طرح کے فسادات تھے، اور میں ''انصار'' میں ان فرقہ پرستوں، قاتلوں اور مسلمان دشمن جماعتوں کے خلاف تیز وتند انداز میں لکھتا تھا، اور یوپی حکومت کی طرف سے بار بار تنبیہ اور نوٹس آتی تھی، حتیٰ کہ گرفتاری اور سزا کی باری آگئی مگر مولانا نامی نے حکومت کو اطمینان دلایا کہ وہ اخبار پر کنٹرول کریں گے، اور مجھ سے کہا کہ آپ یوپی میں پنجاب کا انداز تحریر اختیار نہ کریں ورنہ اخبار بند ہوجائے گا، میں نے مولانا فارقلیط صاحب کو اس سلسلہ میں لکھا تو انھون نے بھی یہی کہا کہ دہلی کا معاملہ اور ہے، یوپی کا اور! قلم سنبھال کر لکھئے! اسی دوران یوپی حکومت کا ایک سرکلر تمام عدالتوں میں پہونچا کہ اخبار ''انصار'' کو کوئی اشتہار نہ دیا جائے، وہ حکومت کے نزدیک غیر مقبول اخبار ہے، اسلئے کسی طرح سات ماہ جاری رکھ کر اسے بند کردینا پڑا، میرے مضامین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ ''صدقِ جدید'' میں بڑے انشراح سے ''ایک غیور صحافی'' ''ایک بے باک صحافی'' وغیرہ کے حوالہ سے بلا تبصرہ نقل کرتے تھے، عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار ''عصرِ جدید'' میں مولانا دریابادی کے خلاف ایک نہایت گستاخانہ مضمون لکھا، میں نے انصار میں اسی انداز کا جواب لکھا اور مولانا دریابادی سے وقتی اختلاف کے باوجود ان کی طرف داری کی، اس وجہ سے وہ میری حوصلہ افزائی کرنے لگے، ورنہ اس سے پہلے ''زمزم'' میں ان کے

خلاف دو کالم میں لمبا چوڑا مضمون لکھ چکا تھا۔

زندہ دلانِ پنجاب کے رنگین شہر اور مرکز شعر و ادب لاہور جیسے بارونق و پُر بہار جگہ کے مقابلہ میں بہرائچ ایک سنسان اور بے کیف و کم مقام تھا، جس کو غازی میاں کی وجہ سے شہرت تھی، لاہور کے مقابلہ میں یہاں کا قیام بالکل بے کیف تھا، مگر چونکہ مزاج مدرسہ کا تھا اس لئے یہاں مدرسہ نور العلوم دلچسپی کا مرکز بن رہا، مولانا عبد الحفیظ صاحب بلیاوی، مولانا سید حمید الدین صاحب، حافظ محمد نعمان صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب، حافظ عبد العزیز صاحب اور حافظ اعمیٰ صاحب یہاں کے مخلص و با اخلاق اساتذہ تھے، میں بھی بعض کتابیں پڑھاتا تھا، اکثر وقت وہیں گذرتا تھا، خصوصاً مولانا بلیاوی کی دلچسپ علمی و ادبی مجلس بڑی پُر کشش تھی، طلبہ و مدرسین میں وقت گذرتا تھا، مبارکپور کے کپڑوں کے بعض تاجر بھی آتے جاتے تھے، اخبار کے کاغذ کے سلسلہ میں مولانا نامی کے یہاں لکھنؤ آنا جانا ہوتا تھا، راستہ میں گونڈہ شہر کے مدرسہ فرقانیہ سے بھی تعلق ہو گیا تھا، ابوزکریا بن علی خطیب تبریزی کی شرح ''دیوان الحماسة'' پہلی بار یہیں کے کتب خانہ سے لے کر دیکھی تھی، یہیں کے دوران قیام تقسیم کے بعد مسلمانوں کی پہلی کانفرنس مولانا آزاد کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوئی جس میں مسلم جماعتون کو سیاسی سرگرمی الگ ہو کر ثقافتی و تہذیبی اور دینی و مذہبی خدمات کا فیصلہ کیا گیا تھا، اور میں اس میں شریک ہوا تھا، اسی دوران گاندھی جی کا قتل ہوا تھا، اور بہرائچ میں ماتمی جلوس نکلا تھا، جس میں ہم لوگ شریک تھے۔

یہاں کے خواجہ محمد خلیل اسمبلی کے ممبر اور درگاہ سالار مسعود غازیؒ کی کمیٹی کے چیرمین تھے، وہ اپنے ذہن و مزاج کے آدمی تھے، ہم لوگ اکثر درگاہ میں تفریح کے لئے جاتے تھے، اسی کے قریب انارکلی نام کا ایک تالاب ہے اس میں مچھلی کے شکار کے لئے جایا کرتے تھے، ابن بطوطہ نے بہرائچ میں بانس کے جنگل اور اس میں گینڈے کا ذکر کیا ہے، درگاہ کے شمال میں بانسوں کا جنگل تھا وہاں سے میں نے ایک چھڑی کاٹی

تھی ، یہاں شاہ نعیم اللہ بہرائچی اور بعض دوسرے مشائخ کے مزار ہیں ، یہاں ایک معمولی سے کتب خانہ میں ابوالعلاء معرّی کا دیوان ''سقط الزند'' تھا جس کو میں نے ۸/صفر ۱۳۶۷ھ میں ڈھائی روپئے میں خریدا، جو ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں مصر میں چھپا ہے۔

تذکرہ مشاہیرِ اعظم گڈھ ومبارکپور:۔قیام بہرائچ کے دوران میں نے ''تذکرہ مشاہیرِ اعظم گڈھ ومبارکپور'' کے عنوان سے کتاب لکھنے کی ابتداء جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ میں کی ، اوراچھا خاصا مسوّدہ تیار ہوگیا ، بعد میں اسی سے ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' ۱۹۷۴ء میں شائع کیا ، یہ پوری بیاض منتشر شکل میں میرے پاس موجود ہے۔

..................☆☆☆☆☆☆☆..................

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں (شوال ۱۳۶۷ھ تا شعبان ۱۳۶۷ھ)

میں رجب ۱۳۶۷ھ میں اخبار ''انصار'' بند کر کے وطن چلا آیا، اب پھر کام کی تلاش ہوئی ،مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کولکھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرسی کی جگہ ہوتو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے یہاں میرے بارے میں سفارش کردیں جو اس کے صدر مدرس تھے، (مدرسہ عالیہ کلکتہ تقسیم کے بعد ڈھاکہ چلا گیا،عمارت باقی تھی اسی میں مولانا آزاد نے اپنے اثر ورسوخ سے دوبارہ جاری کیا تھا اور نئے نظام کے تحت مدرسین رکھے گئے تھے) مفتی صاحب نے جواب دیا کہ میرے حوالہ سے آپ ان کوخط لکھیں کوئی جگہ ہوگی تو لے لیں ،مگر میرا خط جانے سے پہلے ہی وہاں کسی کا تقرر ہو چکا تھا جیسا کہ مولانا اکبرآبادی نے مجھے جواب دیا۔

اس زمانہ میں جامعہ ڈابھیل کے لئے طلبہ اور مدرسین کی تلاش تھی ،اورسفرخرچ بھی دیا جاتا تھا،تنخواہ بھی اس وقت کے لحاظ سے اچھی ہوتی تھی ،مگراکثر درمیان سال

میں مدرسین کو کسی نہ کسی بہانے سے رخصت کر دیا جاتا تھا، اور یہ بے چارے کسی طرف کے نہیں ہوتے تھے، اس لئے وہاں جانے میں پس وپیش تھا مگر مرتا کیا نہ کرتا سو روپیہ کے مشاہرہ پر چلا گیا،

ڈابھیل کا یہ سفر مبارکپور کے حجاج کے ساتھ ہوا تھا، راستہ میں ریل میں میرا بستر گم ہو گیا، ان ہی میں سے کسی کے بستر میں لوگوں نے ڈال دیا تھا، بھساول میں بہت تلاش کیا لیکن نہیں ملا تو ڈابھیل پہونچ کر دوسرے دن اس کی تلاش میں بمبئ گیا، یہ بمبئ کا پہلا سفر تھا بستر تو نہیں ملا مگر اس سفر کی یادگار میں نے امام ابن قیم کی کتاب ''**الجواب الکافی لمن سئل عن الدواء الشافی**'' شرف الدین الکتبی کے یہاں سے ۲۰/شوال ۱۳۶۷ھ کو خریدی، محمد علی روڈ پر **المکتبة الحجازیہ** کا بورڈ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اور بعد میں اسی میں ''رجال السند والھند'' چھپی، اس کو بارہ بنکی کے مولوی عطاء اللہ نے جاری کیا تھا، ان کے لڑکے مولوی ضیاء اللہ نے میری کتاب طبع کی، بہار کے محمد مشتاق نے کمپوز کیا۔

<u>ڈابھیل میں زیر تدریس کتابیں اور یہاں کے احوال</u>:۔ یہاں میرے ذمہ شرح جامی، مقاماتِ حریری، مختصر المعانی، **سفینة البلغاء**، النحو الواضح اور اسی قسم کی کتابیں تھیں، درمیان سال میں سات مدرس واپس کئے گئے جن میں فتاویٰ دارالعلوم کے مرتب بھی تھے، یہ یہاں کی پرانی روش تھی، بڑے بڑے اہل علم اور بزرگ یہاں سے اسی طرح الگ کئے جا چکے تھے جن کے قصے ہم مدرسین سنتے سناتے تھے، میری تنخواہ میں صفر ۱۳۶۸ھ میں دس روپیہ کا اضافہ ہوا تھا۔ مگر درمیان سال ہی میں اندازہ ہو گیا کہ آئندہ یہاں آنا نہیں ہوگا، یہاں افریقہ اور لندن وغیرہ جانے کیلئے گجراتی طلبہ مولویت کی سند کیلئے پڑھتے تھے تاکہ امامت وخطابت اور فتویٰ کے نام پر ان کو وہاں قیام مل جائے، اس لئے پڑھنے میں محنت بہت کم کرتے تھے اور مدرسین کے بارے میں ان ہی کا فتویٰ چلتا تھا، جس مدرس کے بارے میں طلبہ کی جیسی رائے

ہوتی تھی ویسا ہی معاملہ ہوتا تھا، درمیان میں ساتوں مدرسین کی رخصتی ان کے شاگردوں کی ناپسندیدگی کی بناپر ہوئی تھی، یہاں جو مدرس گردن اٹھا کر لمبی چوڑی تقریر کرتا تھا اوراناپ شناپ حوالے دیتا تھا وہ بہت قابل ''موٹا مولوی پچھے'' مانا جاتا تھا، اور جو مدرس سنجیدگی سے نفس مضمون اور کتاب پڑھاتا تھا وہ نا قابل تھا، میں مقامات حریری اورادب کی دوسری کتابیں پڑھاتے وقت کبھی کبھی لغات اور حواشی کی مراجعت کرتا تھا، اس لئے میں نا قابل مولوی تھا اور میں انتہائی احتیاط کی بناپر ایسا کرتا تھا حالانکہ میں بھی بے پَر کی اڑا سکتا تھا مگر یہ بات دیانتداری اورایمان داری کے خلاف تھی، اس لئے مجھے معلوم ہو گیا کہ آئندہ سال مجھے یہاں آنا نصیب نہیں ہوگا اور وہاں سے نکلتے وقت ایک شعر کہا تھا ؎

خلوصِ سکنۂ گجرات تاجرانہ ۔۔۔ یہاں کے لوگ عموماً وفا شعار نہیں

چنانچہ شعبان میں وطن آیا تو وہاں سے بصورت الفاظ علیحدگی کا رجسٹری لفافہ آ گیا، اللہ کا شکر ہے کہ درمیان سال میں اس کی نوبت نہیں آئی، جب کہ بے چارے سات مدرسین درمیان میں الگ کئے گئے۔

مولانا محمد یوسف بنوری و مولانا محمد مالک کاندھلوی:۔اس وقت جامعہ اسلامیہ میں مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ شیخ الحدیث تھے، ان کے علاوہ مولانا محمد مالک بن مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجیؒ، اور مولانا عبدالجبار صاحب معروفیؒ مشاہیر مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد الجبار صاحب معروفیؒ بعد میں آئے تھے، مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجی خاموش طبیعت کے نیک عالم تھے مگر میں نے ان کو بہت بے تکلف بنادیا تھا، وہ مجھ سے بیحد مانوس رہتے تھے۔

ایک اصولی بات:۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بستی میں بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے، ڈابھیل جانے کے چند دن بعد انھوں نے عصر کے بعد مدرسین کو

چاء کی دعوت دی، ان میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ بھی تھے جو مدت سے سورت میں قیام پذیر تھے، اور جامعہ اسلامیہ میں تشریف لایا کرتے تھے، مولانا بنوری نے سب سے پہلے چاء کی پیالی میری طرف بڑھائی اور میں نے حضرت مفتی صاحب کی طرف بڑھادی، مولانا بنوری نے فوراً مجھے ٹوکا کہ آپ پہلی بار میرے یہاں آئے ہیں اور میرے انتظام میں دخل دیتے ہیں، میں مفتی صاحب کے مقام ومرتبہ سے واقف ہوں، اس کے باوجود میں نے چاء کی پیالی کچھ سمجھ کر آپ کے سامنے رکھی ہے، میں نے اس اصول پر اپنی غلطی تسلیم کرلی، کسی کے یہاں جاکر اس کے معاملات میں دخل دینا بالکل غیر مناسب حرکت ہے۔

ہم لوگ اکثر جمعہ کو سورت اور راندیر جایا کرتے تھے، جہاں مدرسہ اشرفیہ اور مدرسہ حسینیہ تھے، اس زمانہ میں گجرات میں جامعہ اسلامیہ کے بعد یہی دونوں مدرسے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے، بعد میں کئی بڑے مدارس جاری ہوئے، کبھی کبھی نوساری بھی جانا ہوتا تھا۔

کتاب الحجة علیٰ اهل المدينة:۔ مولانا مفتی مہدی حسن صاحب امام محمدؒ کی کتاب **کتاب الحجة علیٰ اهل المدينة** کا حاشیہ (جو شرح کی حیثیت رکھتا ہے) مکمل کرچکے تھے، ہم لوگ سورت جاتے تو اس کے خاص خاص مقامات پڑھ کر سناتے تھے، انھوں نے ہم لوگوں کو امام ابن قیمؒ کی تصوف کی کتاب ''**مدارج السالكين**'' کی دوضخیم جلدیں عنایت کی تھیں جو تین جلدوں میں چھپی تھی، ان کی زندگی کے آخری دور میں **کتاب الحجة علیٰ اهل المدينة** اس کے شروح وحواشی کے ساتھ لجنۃ احیاء المعارف حیدرآباد سے چار ضخیم جلدوں میں چھپی اور میں نے ''معارف'' میں اس پر تبصرہ لکھا،

مجلس علمی:۔ یہاں کی مجلس علمی کی سرگرمی اس وقت تقریباً ختم تھی، مولانا بنوریؒ اس کے مشرف بلکہ روح تھے، مگر دوسرے ارکان کی بے توجہی سے کوئی کام نہیں

ہو رہا تھا۔

جامعہ اسلامیہ کے تقریباً جملہ اخراجات افریقہ کے گجراتی تاجروں اور مالداروں کی طرف سے آتے تھے، خاص طور سے ابراہیم گارڈی صاحب کا نام سرِ فہرست تھا، اس وقت جامعہ اسلامیہ میں ایک شعر مشہور تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ'' گارڈی نے علم کی میخ گاڑ دی''

جامعہ کا عظیم الشان کتب خانہ اور ''رجال السند والہند'' کی ابتداء:

۔ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت کے اختلاف کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے مشہور اساطین علم اٹھ کر مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں آ گئے اور اس کو جامعہ اسلامیہ بنا دیا، مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب امروہوی اور دوسرے اہل علم، اہل تحقیق اور اہل ذوق نے یہاں آ کر دیگر علمی و دینی خدمات کی طرح ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ جامعہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا اور ہر علم وفن کی امہات کتب جمع کیں کرائیں، اہل علم واہل دل نے مل کر یہ بڑا کام کیا، یہ کتب خانہ میرے لئے بڑا پُر کشش تھا، مختلف علوم وفنون خصوصاً تاریخ وادب کی کتابیں خوب پڑھتا تھا اور اپنے ذوق کی باتیں نقل کرتا تھا، ایک روز احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق **کان اصلہٗ سندیاً** دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہل علم وفضل سندی ھندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، وقت وقت کی بات ہے، ورنہ اس سے پہلے دیوان حماسہ وغیرہ میں ابو عطاء السندی کے اشعار بار بار نظر سے گزرے مگر اس کا احساس نہیں ہوا، بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں **رجال السند والہند** کی شکل میں سامنے آیا، ''تھیج صغیرات الامور کبیرھا'' بالکل صحیح ہے

اب رات دن چلتے پھرتے حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی تاریخ ورجال کی کتابیں مطالعہ کرنے لگا، ایک دن میں کئی کئی کتابیں سرسری طور سے دیکھتا اور جہاں کوئی سندھی اور ھندی شخصیت نظر آتی فوراً نقل کرلیتا، ایک دن کتب خانہ کے ناظم نے کہا کہ مولانا ساری کتابیں کمرے میں لیجایئے تاکہ بار بار داخل خارج نہ کرنا پڑے، **رجال السند والھند** کے مسوّدے کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔

''إبتداء التالیف فی ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۸ھ و ذٰلک فی الجامعة الاسلامیة ،دابیل (سورت)التدوین جارٍ''

۲۱/سال کے بعد تحریر ملی:۔ میں کتب خانہ کی نادر ونایاب کتابوں سے اپنے ذوق کی چیزیں نقل کرلیا کرتا تھا، چنانچہ ابوعلی قالی بغدادی کی کتاب **''الامالی''** سے ادبی شہ پارے بڑے سائز کے دس صفحات میں نقل کئے جو کلبی کی کتاب **''الاصنام''** میں پڑے رہ گئے اور میں ان کو بھول گیا، اور قیام بمبئی کے دوران ۱۴/ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کو مدرسہ فلاح دارین ترکیسر گیا واپسی پر جامعہ اسلامیہ گیا تو اتفاق سے کتب خانہ کے نوادرات میں **کتاب الاصنام** میں وہ صفحات مل گئے اور میں نے ناظم کتب خانہ سے اجازت لے کر اپنے پاس رکھ لیا جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

اس کے اور بہت سے اقتباسات میں نے اس کتب خانہ کے نوادرات سے لئے ، عام طور سے مدرسوں کے کتب خانوں میں درسیات اور ان کے متعلق شروح وحواشی ہوتے ہیں، مگر یہاں ہر علم وفن کی نادر ونایاب اور امہات کتب تھیں، اس سے پہلے میں نے کسی مدرسہ میں ایسا کتب خانہ نہیں دیکھا تھا، کتب بینی ومطالعہ کا شوق بچپن سے تھا اس لئے اس سے خوب خوب استفادہ کیا اور ''رجال السند والہند'' کی تالیف کی ابتداء یہیں کی۔

☆☆☆☆☆☆☆

سفرِ بمبئی (ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ، نومبر ۱۹۴۹ء)

زمانۂ طالب علمی میں یہ خیال ہوتا تھا کہ کبھی اللہ تعالیٰ حج وزیارت کی توفیق دے گا تو بمبئی بھی دیکھنے کا موقع ملے گا، کسے معلوم تھا کہ جس شہر میں اعظم گڈھ کے علامہ شبلی غزل کہا کرتے تھے اس میں اسی ضلع کا ایک شخص بقول مولانا عبدالماجد دریابادی تحقیقی وعلمی اور دینی مقالات اور کتابوں کا انبار جمع کرے گا، اور دولت وتجارت کے بین الاقوامی شہر کے ایک گوشے میں بیٹھ کر زندگی کا بہترین حصہ تصنیف وتالیف اور صحافت میں گزارے گا، مقدرات کا علم کسی کو نہیں ہے۔

مبارکپور، امرتسر، لاہور، بہرائچ اور ڈابھیل کا چکر کاٹنے کے بعد بھی صحرا نوردی اور بادیہ پیمائی کا ذوق کم نہ ہوا، ایک طرف علمی ذوق وشوق کی فراوانی اور دوسری طرف حالات کی تنگ دامانی، عجیب کشمکش میں مبتلا تھا، اسی دوران خیال آیا کہ بمبئی میں مولانا حکیم اعظمی ناظم جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کو اس سلسلہ میں خط لکھوں، مولانا حکیم فصیح اللہ خان صاحب اعظمی، موضع حمید پور، ندوہ سرائے، کے رہنے والے تھے، مستقل قیام بمبئی میں تھا، جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے ناظم اور بمبئی کی مسلم سیاست کے سرگرم رکن تھے، عوام اور حکومت میں اثر ورسوخ رکھتے تھے، وہ ''زمزم'' اور ''انصار'' میں میرے مضامین اور اشعار دیکھتے تھے اور وطنیت کی بنا پر جانبین کو غائبانہ تعلق تھا، کبھی کبھی وہ جمعیۃ علماء کے مراسلات بھی بھیج دیا کرتے تھے، چنانچہ میں نے ان کو لکھا کہ میں اس وقت ملازمت کی تلاش میں ہوں، بمبئی میں کوئی جگہ ہو تو مجھے بلالیں، یہ خط جمعیۃ علماء کے دفتر میں ایسے وقت پہونچا کہ جب جمعیۃ علماء کا ایک وفد حج وزیارت کے سفر میں جاتے ہوئے دفتر میں مقیم تھا، جس میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، ومولانا سید محمد میاں صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب شامل تھے، ان حضرات نے حکم دیا کہ یہ شخص بڑے کام کا ہے، حالات سے پریشان ہے، آپ بلالیں کوئی نہ

کوئی کام مل جائے گا، حکیم صاحب نے مجھے جواب دیا کہ فی الحال کوئی کام نہیں سامنے نہیں ہے مگر آپ آ جایئے، میں آپ کو آرام پہونچانے کی کوشش کروں گا، اور میں یوم جمعہ ۲۸/ ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ، نومبر ۱۹۴۹ء کو بمبئی پہنچ گیا، اس وقت بمبئی کا کرایہ ۲۷/ روپیہ تھا جبکہ اس سے پہلے ۱۷/ روپیہ تھا۔

مجھ سے پہلے مبارکپور کے دو عالم بمبئی میں رہتے تھے، ملا رحمت علی اسمٰعیلی نے زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا، آخر میں ملا سیف الدین طاہر سے اختلاف کے بعد وطن آ گئے، دوسرے ہمارے محلّہ کے مولوی محمد یوسف ''آوارہ بمبئی'' وہاں کے اخبارات میں کام کرتے تھے، آخر میں بھیونڈی میں مدرسی کے زمانہ میں وہیں فوت ہوئے۔

میرا قیام دفتر جمعیۃ علماء وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار میں رہا، حکیم صاحب نے اپنے ایک دوست غیاث الدین ہوٹل والے کے یہاں دونوں وقت کھانے کا انتظام کر دیا اور میرے ذمہ دفتر میں فتویٰ نویسی کر دی نیز بعض دوسرے تحریری کام سپرد کئے، انچارج آفس مولانا معین الدین صاحب مرحوم ندوہ سرائے کے تھے، بہت نیک آدمی تھے، میرا بہت خیال کرتے تھے وہی میرے ہمدم و رفیق تھے، حکیم ساحب کسی کسی موقع سے میری جیب میں دس پانچ یا اس سے کم زیادہ روپیہ ڈال دیا دیتے تھے، دفتر ہی میں دو لڑکوں کو شرح وقایہ، اصول الشاشی وغیرہ پڑھاتا تھا، ان سے پچاس روپے مل جاتے تھے، اس زمانہ میں صبح کو صرف ایک کپ چائے ایک آنے میں پی لیتا تھا، اور کہتا تھا کہ مجھے ناشتہ کی عادت نہیں ہے، اس طرح میں نے نومبر ۱۹۴۹ء سے جون ۱۹۵۰ء تک تقریباً ۸/ ماہ گزارے، خیال آتا ہے کہ اسی دور میں دو کرتے بھی سلوائے، دفتر جمعیۃ علماء کے کتب خانہ میں کنز العمال، مستدرک حاکم، سنن الکبریٰ بیہقی اور بعض دوسری احادیث کی کتابیں تھیں، ان سے استفادہ کرتا تھا، اسی زمانہ کی نقل کی ہوئی احادیث وآثار میری کتاب ''اسلامی شادی'' میں ہیں، نیز اسی زمانہ میں رسائل جاحظ اور جمہرۃ

اشعار العرب، ابوزید محمد بن ابوالخطاب قرشی پرانی کتابوں کے ایک مکتبہ سے خریدی، یہ دونوں کتابیں ہندوستان کے مشہور عربی ادیب مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف سورتی کی ملکیت اور استعمال میں رہ چکی تھیں اور دونوں پر ان کے جگہ جگہ نہایت نادر اور قیمتی حواشی ہیں، جمہرۃ اشعار العرب کے پہلے صفحہ پر میں نے یہ یادداشت لکھی۔

''قال ابو المعالی القاضی اطهر المبارکفوری إنتقلت إلیّ هذہٖ النسخة الفقیدة الفریدة المحشّاة بتحشیة الادیب الاریب السورتی المرحوم فی ۲۹/ صفر ۱۳۶۹ھ یوم الثلاثاء من مکتبة المنار بمبئی وإشتریتها بخمس روبیاتٍ و کان قدامی إلیها فی سبیل إبتغاء فضل اللہ تعالیٰ فی یوم الجمعة ۲۸/ذی الحجه ۱۳۶۸ھ

میری پہلی کتاب ''اسلامی نظام زندگی'' بمبئی کیلئے میں اور میرے لئے بمبئی دونوں اجنبی تھے، میں اپنی تمام ترحیثیات کو سمیٹے ہوئے معمولی لکھے پڑھے آدمی کی طرح رہنے لگا، اس شہر میں مقام پیدا کرنے میں دیر لگتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور حکیم اعظمی صاحب اور بعض دوسرے مخلصوں کی وجہ سے چند ہی دنوں میں بعض قدردان مل گئے جن میں سب سے پہلے جناب عبداللہ بن احمد عرب سمکری مکی، خان منزل، کھانڈیا اسٹریٹ تھے، حاجی عبداللہ عرب صاحب نسلاً تو ہندوستانی تھے مگر ان کے آباء واجداد مکہ مکرمہ میں مقیم ہو گئے تھے، نہایت نیک، بزرگ اور علماء کے قدردان خاص طور سے مولانا آزاد اور جمیعۃ علماء سے بے حد عقیدت ومحبت رکھتے تھے، قد وقامت، لب ولہجہ اور شکل وصورت میں بالکل عرب معلوم ہوتے تھے، اپنے علاقہ کے کانگریس کے صدر تھے اور ٹرنک کے ایک چھوٹے سے کارخانہ کے مالک تھے، ان کی عرب بیوی جمیلہ بنت ابوحمیدی کا چند ماہ پہلے انتقال ہو گیا تھا، بالکل مجرد تھے، تقریباً اسی سال کی عمر تھی، حکیم اعظمی کے ذریعہ ان سے اچھا خاصا تعارف ہو گیا اور وہ میرے حال پر شفقت کی نظر رکھنے لگے، میں خان منزل کی سطح پر مغرب کے بعد عربی

پڑھانے لگا اور نصاب میں مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی کی تحریک ترجمہ قرآن کی کتاب ''مفتاح القرآن'' کو رکھا، اسی بلڈنگ میں ایک صاحب عبد الغفور لادی والا تھے، وہ مجھے مہینہ میں غالبًا ٢٥/ روپیہ دیتے تھے، ایک دن باتوں بات میں حاجی عبداللہ صاحب نے اپنی مرحومہ بیوی کے ایصالِ ثواب کے لئے کوئی دینی مختصر سی کتاب چھپانے اور تقسیم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، وہ اس سے پہلے مشکوٰۃ شریف کی کچھ احادیث کو کتابی شکل میں شائع کر چکے تھے، میرے پاس ''زمزم'' کے دینی واخلاقی مضامین کے تراشے تھے، حاجی صاحب نے ان کو پسند کر کے جیب سائز کے ٢٥٦/ صفحات میں ''حیات جمیلہ'' یعنی اسلامی نظام زندگی'' کے نام سے شائع کیا، یہ میری پہلی کتاب ہے، مقدمہ میں ١٥/محرم ١٣٦٩ھ درج ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بمبئی آنے کے ١٥۔١٦۔ دن کے بعد اس کی تیاری ہو چکی تھی، حضرت مولانا سید محمد میاں اس وقت بمبئی تشریف لائے تو ان سے مقدمہ لکھوایا، ١٦/دسمبر ١٩٤٩ء کو لکھا گیا ہے یہ کتاب دو ہزار میں سلطانی پریس بمبئی میں چھپی اور حاجی صاحب نے ان کو مفت تقسیم کیا اور ملک کے مختلف علاقوں سے لوگوں نے طلب کیا، اس قدر جلد اس کتاب کی اشاعت سے میرے تعارف میں بڑی مدد ملی ۔ اسی زمانہ میں یعنی ١٩٥٠ء میں ''افادات حسن بصریؒ'' کے نام ایک رسالہ ٥٦/صفحات کا میں نے دائرہ ملیہ مبارکپور اعظم گڈھ کی طرف سے شائع اس کے مقدمہ میں ٨/ذی قعدہ ١٣٦٦ھ مطابق ١٢/ دسمبر ١٩٤٧ء درج ہے، میں نے اس کو احیاء العلوم کی عارضی مدرسی کے زمانہ میں لکھا تھا،

میرا مزاج مدرسوں اور کتابوں کا تھا اور اسی فضا میں زندگی بسر کرنے کا ارادہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی صورت میں اس سے منسلک رکھا البتہ مدرسوں کی سیاست کی وجہ سے ظاہری دوری رہی، بمبئی میں کوئی عربی مدرسہ نہیں تھا، محلّہ محلّہ انجمنوں اور مسجدوں میں مدرسہ عربیہ جاری تھا جس میں قرآن شریف اور دینیات کی معمولی تعلیم ہوتی تھی، یہ عجیب سانحہ ہے کہ ھندوستان کے مدارس بمبئی کے صدقات وتبرعات سے

مستفید ہوتے ہیں، مگر وہاں کوئی بڑا مدرسہ نہیں ہے، کسی زمانہ میں مدرسہ ہاشمیہ اور مدرسہ محمدیہ تھے مگر دونوں ہاشمیہ ہائی اسکول اور محمدیہ ہائی اسکول بن گئے، ابتدائی عربی درجات کا ایک مدرسہ مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب بہاری چلا رہے تھے، اور پورے مہاراشٹر میں مالیگاؤں میں مدرسہ بیت العلوم (اورینٹل کالج) تھا جس میں مولانا مفتی محمد نقی صاحب وغیرہ دیوبندی تعلیم دیتے تھے، اسی دور میں جمعیۃ علماء کے اراکین بمبئی آئے اور مجھے مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں میں مدرسی کی پیشکش کی، مگر بعض وجوہ کی بنا پر میں نہیں جا سکا، البتہ مالیگاؤں آمد ورفت مختلف تقریبات میں ہوتی رہی۔

جمہوریت، ۱۵؍جون ۱۹۵۰ء:۔ اسی دوران جمعیۃ علماء کے حلقہ کے چند لوگوں نے ’’جمہوریت‘‘ کے نام سے ایک روزنامہ نکالنے کا پروگرام بنایا، اخبار کی پالیسی جمعیۃ علماء کے مطابق رہے گی، مشورہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ بھی شریک تھے، اخبار مدینہ بجنور سے مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کو بلایا گیا، اور مجھ کو ان کے نائب کی حیثیت سے رکھا گیا، غازی صاحب کا مشاہرہ چار سو روپیہ طے کر کے قیام کے لئے ایک فلیٹ دیا گیا اور میرا مشاہرہ ایک سو چالیس روپیہ ٹھہرا، قیام جمعیۃ علماء کے دفتر میں تھا ہی، ۱۵؍جون ۱۹۵۰ء کی صبح کو پہلا شمارہ نکلا، ’’افکار ومطالعات، علمی، تاریخی، سیاسی‘‘ کے مستقل عنوان سے روزانہ چار پانچ کالم لکھتا تھا، درمیان میں ’’قرآنی جواہر پارے‘‘ کے عنوان سے ایک آیت کی تشریح ہوتی تھی، اس کے علاوہ اکثر پیشتر لمبے چوڑے علمی تاریخی اور سیاسی مضامین لکھتا تھا، میری غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں، اس کے ساتھ مراسلات کی کانٹ چھانٹ اور پریس کے لئے اخبار کی کاپی جوڑنا بھی میرے ذمہ تھا اور انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ دلچسپ، معلوماتی، علمی تاریخی، دینی اور سیاسی مضامین لکھتا تھا، دوسری طرف غازی صاحب کا الفاظ سے کھیلنے والا جوشیلا ایڈیٹوریل ہوتا، اور دیکھتے ہی دیکھتے جمہوریت بمبئی کا مقبول ترین اخبار بن گیا، اور یہاں کا قدیم مشہور روزنامہ ’’انقلاب‘‘ کی مقبولیت کم

ہونے لگی، اس کے مالک جناب عبد الحمید انصاری سخت پریشانی میں پڑ گئے، کئی مولویوں سے ''انقلاب'' میں دینی واخلاقی مضامین نقل کروانے لگے، اور دونوں اخبار ایک دوسرے کے حریف بن گئے، نیز بمبئی کے دوسرے اخبارات پر اس کے اثرات پڑنے لگے، یہ صورت صحافیوں اور اخبار بینوں میں ایک دلچسپ وقتی مشغلہ بن گئی اور میرے لئے وقتی پریشانی کا باعث بن گئی، کیونکہ میں چار چار پانچ پانچ کالم میں علمی تاریخی، دینی اور سیاسی مضامین لکھنے کے ساتھ اکثر وبیشتر طول طویل مضامین بھی لکھتا تھا مگر میرا نام کہیں نہیں آتا تھا، مولانا حامد الانصاری غازی مجھے اخلاص سے دینی خدمت کرنے کی تلقین کرتے تھے، نام ونمود اور ریا سے منع کرتے تھے، کہتے تھے کہ بنیاد کا پتھر نیچے ہوتا ہے، آپ بنیاد کے پتھر ہیں، اگر میں اپنا نام اوپر یا نیچے لکھتا تو قلم زد کر دیتے تھے، اور میں سمجھتا تھا کہ عمارت جس قدر بلند بالا ہوتی جائے گی بنیاد کا پتھر اتنا ہی زیر زمین ہوتا جائے گا، جب میں اخبار کے ذمہ داروں سے کہتا کہ یہ سب میرے مضامین ہوتے ہیں تو وہ کہتے تھے کہ ہم کیا جانیں، غازی صاحب کہتے ہیں کہ قاضی صاحب صرف قرآنی جواہر پارے اور مراسلات دیکھتے ہیں، اخبار بیں طبقہ بھی کہتا کہ ہم تو مضامین غازی صاحب کے سمجھتے ہیں۔

لاہور میں مولانا فارقلیط صاحب نے غازی صاحب کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں، جن کی وجہ سے میں محتاط رہا کرتا تھا، ویسے وہ بظاہر میری بڑی قدر کرتے تھے اور میری تعریف دوسروں سے بھی کیا کرتے تھے، اور میں سوچتا تھا کہ چھ سات مہینے تک اس عالمی شہر میں میں نے اپنی تمام تر حیثیات کو چھپائے رکھا اور اب موقع آیا کہ میرا تعارف ہو تو یہ صورت حال ہوگئی جس سے میں سخت پریشانی میں رہا کرتا تھا، اسی درمیان جمہوریت کے ڈائرکٹروں تاجرانہ ذہنیت کام کرنے لگی اور وہ اپنے اپنے مفاد میں کام کرنے لگے، سازشیں بھی ہونے لگیں، نیوز ایڈیٹر ذاکر حسین فاروقی کہا کرتے تھے کہ سب سے پہلے میں یہاں سے نکالا جاؤں گا، اس کے بعد

قاضی صاحب کی باری آئے گی ، وہ بمبئی کے مشہور صحافی تھے ان کے لئے میدان خالی تھا ، اور مجھ سے کہا کرتے تھے قاضی صاحب جس دن آپ یہاں سے نکلیں گے اسی دن میں آپ کو کام دلاؤں گا ، آپ بالکل مطمئن رہیں ، چنانچہ وہ مجھ سے پہلے الگ ہو گئے ۔

وفات شریف انور :۔ نومبر ۱۹۴۹ء بمبئی آیا تھا اور ایک سال کے بعد ۲۸ / نومبر ۱۹۵۰ء میں مجھے وطن واپس آنا پڑا ، جمہوریت کی ملازمت میں ساڑھے چار ماہ ہوئے تھے ، میرے بچے شریف انور مرحوم کی بیماری کا خط پا کر میں رخصت لے کر ۲۸ / نومبر کو گھر چلا آیا ، وہ بھی اپنے بھائی جمال انور کی طرح چیچک میں مبتلا ہو کر ۲۲ / جنوری ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳ / ربیع لآخر ۱۳۷۰ھ میں انتقال کر گیا ، یہ اولاد کا دوسرا غم تھا ، کچھ دنوں رہ کر بمبئی واپس گیا ۔

جمہوریت سے انقلاب میں (۲۳ / فروری ۱۹۵۰ء) :۔ وطن سے واپس آ کر اپنی ڈیوٹی کے مطابق ۲ / بجے دن میں جمہوریت کے دفتر میں گیا تو دیکھا کہ میری میز پر ایک دوسرے صاحب بیٹھے لکھ پڑھ رہے ہیں ، غازی صاحب نے قریب ہی میرے لئے کرسی لگوائی ، اور معلوم ہوا کہ جمہوریت کے ڈائرکٹر نے ان کو رکھا ہے ، میں نے ان سے اٹھنے کے لئے کہا تو انھوں نے انکار کر دیا ، اس کے بعد سے معاملات بگڑتے گئے اور میری وقتی پریشانی میں مزید اضافہ ہوتا گیا ، میں نے دہلی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کو لکھا کہ مجھے دہلی بلا لیں ، وہ اس وقت جمعیۃ علماء ھند کے ناظم تھے اور مولانا فارقلیط '' الجمعیۃ '' اخبار کے اڈیٹر تھے ، سوچا کہ دہلی مین جگہ مل جائے تو وہیں چلا جاؤں گا مگر مولانا محمد میاں صاحب نے لکھا کہ آپ کو بمبئی ہی میں رہنا ہے ، حالات کا مقابلہ کیجئے ، '' قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید '' اگر میں بمبئی چھوڑ دئے ہوتا تو شاید میرے کام کرنے کے اتنے سارے مواقع نہ ملتے ، مولانا حکیم اعظمی صاحب اور میرے دوسرے بہی خواہ اس صورت حال سے ایک گونہ پریشان تھے ۔

اس زمانہ میں عام طور سے دس بجے رات کو دفتر جمہوریت سے نکلتے وقت راستہ میں دو چار آنے کی کھجور خرید لیتا اور وہ راستہ میں کھاتا ہوا جمعیۃ علماء کے دفتر میں آتا اور پانی پی کر سو جاتا اس کی خبر میرے کسی بھی بہی خواہ کو نہیں ہوتی تھی ورنہ وہ ایسا ہرگز نہیں کرنے دیتے، حالات روز بروز خراب ہوتے گئے، اور جمہوریت چھوڑنے کے علاوہ کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی، آخر مجبور ہو کر ایک دن ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے یہاں پہونچا اور کہا کہ اب میرا انتظام کردو، اب بات قابو سے باہر ہو چکی ہے، انھوں نے دوسرے دن مجھے بلایا اور دفتر جمہوریت جاتے ہوئے انکے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ اسی طرف سے روزنامہ ''انقلاب'' جاکر عبدالحمید انصاری سے ملاقات کرلیں، میں نے ان کو فون کرکے آپ کا انتظام کرادیا ہے، انصاری سے میں کہا کہ آپ کو مین جمہوریت کی روح نکال کردے رہا ہوں فوراً رکھ لو، انھوں نے نام پوچھا کہ وہ خود آپ سے ملیں گے، ان کا نام جمہوریت میں نہیں آنے پاتا ہے اس لئے نام بتانے سے کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوگی۔

اس کے بعد میں دفتر انقلاب پہونچا اور انصاری صاحب سے بات چیت کی، ''جمہوریت'' کی اشاعت ومقبولیت سے انقلاب پر سخت زد پڑ رہی تھی اور وہ پریشان تھے، انھوں نے بڑے انشراح سے مجھے رکھ لیا، پوچھا کہ جمہوریت کا آپ کے ذمہ کچھ باقی تو نہیں ہے یا کوئی تحریر آپ نے ایسی تو نہیں دی ہے جس کی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا ہو، میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اب میرا قطعی اور آخری فیصلہ ہے کہ جمہوریت میں نہیں جاؤں گا، ان کو اندیشہ تھا کہ ''جمہوریت'' کے بانی اور ارا کین سب قاضی صاحب کے آدمی ہیں، بھلا وہ کیسے ان کو چھوڑ سکتے ہیں اور جمہوریت والوں کی باہمی سیاست میرے بارے میں کوئی کردار ادا نہیں کرسکتی تھی، مشاہرہ ۱۵۰/روپیہ طے ہوا۔

انصاری صاحب نے کہا کہ میں آج کے انقلاب میں آپ کے بارے میں

اعلان کر دیتا ہوں، میں نے کہا کہ ضرور اعلان کر دیں، چنانچہ دوسرے دن ۲۲؍فروری ۱۹۵۰ء کی صبح کو انقلاب آیا تو اس کے آخری صفحہ پر درمیان میں جلی چوکھٹے میں یہ اعلان تھا ”قارئین! یہ پُر مسرت خبر دی جاتی ہے کہ اخبار جمہوریت میں لکھنے والے قاضی اطہر مبارکپوری کے رشحات قلم آج سے انقلاب میں شائع ہوا کریں گے،“ یا اسی قسم کے الفاظ تھے، اور صبح ہوتے ہی یہ انقلابی خبر صحافی برادری اور اخبار بینوں میں بڑے تعجب سے پڑھی گئی، ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا، اور ۲۳؍فروری کو میرا کالم چھپ گیا، ادھر میں انصاری سے مل کر جمہوریت کے دفتر میں پہونچا اور حسب سابق اپنے متعلقہ کام کئے، رات کو چلتے وقت غازی صاحب سے کہا کہ میں کل سے ”انقلاب“ میں جاؤں گا، آپ لوگ کوئی انتظام کرلیں، غازی صاحب یہ سن کر چونکے اور کہا کہ آپ کے لئے دہلی بہت مناسب جگہ تھی، میں نے کہا کہ میں یہیں رہ کر لوگوں سے اپنی حیثیت منواؤں گا، میرے بعد غازی صاحب بھی فوراً دفتر سے نکلے اور ڈائرکٹروں کے پاس جا کر میری بے وفائی اور خود غرضی بیان کرنے لگے، صبح انقلاب میں یہ خبر پڑھ کر ڈائرکٹروں کو اس کا علم ہوگیا، اور ان میں میرے موافق اور مخالف پیدا ہوگئے، اور دفتر جمعیۃ علماء سے مجھ کو نکالنے کی دھمکیاں آنے لگیں، میں نے ذرا شدید لب ولہجہ اختیار کیا اور کہا کہ کس کی جرأت ہے کہ مجھ کو جمعیۃ کے دفتر سے نکال دے؟ میرے کرم فرما جناب اے اے شیخ انجینیر جذباتی آدمی تھے، مجھ سے خاص تعلق رکھتے تھے چونکہ میں نے ان کو پہلے سے اس کی اطلاع نہیں دی تھی اس لئے وہ میرے شدید ترین مخالف بن گئے،

شیخ انجینیر کا آبائی وطن مئو یا کو پا گنج تھا، پونہ میں مقیم ہوئے، شیخ انجینیر مستقل طور سے بمبئی میں ڈنکن روڈ رہتے تھے، حکیم اعظمی سے قدیم مراسم تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب الاعظمی کے بڑے قدرداں تھے، مولانا ان کے یہاں ہفتوں مہینوں ٹھہرتے تھے، شیخ انجینیر نے ان کو متعدد بار حج کرایا، مولانا مئو سے چپکے بمبئی چلے

جاتے تھے اور شیخ انجینیر ان کو حج پر بھیج دیا کرتے تھے، اس وقت ہاتھوں ہاتھ پاسپورٹ وغیرہ بن جاتا تھا، اور بہت کم رقم میں حج ہوتا تھا، یہ سلسلہ میرے بمبئی جانے کے بعد تک جاری تھا۔

شیخ انجینیر کی خفگی:۔ شیخ انجینیر سالوں تک مجھ سے بے حد خفا رہے اور میری صورت دیکھ کر بھاگ جاتے تھے، بکواس بھی کرتے تھے، ایک مرتبہ عبدالحمید انصاری نے ''انقلاب'' میں ''شہ سوار جنگ بہادر'' کے نام سے ایک تیز وتند بلکہ سوقیانہ تازیانہ لکھا، اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہوا، مگر وہ بات نہیں رہی، حکیم اعظمی صاحب کہا کرتے تھے اگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب چاہیں تو شیخ انجینیر کو منٹوں مین ٹھنڈا کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ شیخ انجینیر کی مغفرت فرمائے اس وقت ان سے بڑا میرا کوئی مخالف نہین ہوا تھا، انھون نے ایک مرتبہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دعوت کی اور مجھ سے کہا کہ دعوت میں آنا، حکیم اعظمی نے کہا کہ جب وہ خود بلاتے ہیں تو آپ چلے جائیں، اسکے بعد ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

''جمہوریت'' کے اراکین اپنے لوگ تھے، جمہوریت اپنا اخبار تھا، ''انقلاب'' غیر کا تھا اس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ایک گونہ بے تعلقی تھی، اس کے باوجود ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ مجھے بادل ناخواستہ انقلاب میں آنا پڑا اور مجھے بے حد قلبی تکلیف ہوئی، مگر اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے، اچھا کرتا ہے، اب مجھے کھل کر کام کرنے اور اپنے علوم ومعلومات عوام تک پہونچانے میں ہر قسم کی آزادی نہیں بلکہ تشجیع بھی تھی،

نتیجہ کے طور پر جمہوریت آہستہ آہستہ رُو بہ زوال ہونے لگا، بعد میں غازی صاحب اس کو جمعیۃ کے دفتر کے بازو والے کمرے میں لائے اور ہفتہ وار جاری کیا، آخر میں جمیل مہدی نے آکر غازی صاحب کو اس سے بے دخل کر دیا، غازی صاحب کو بعد میں احساس ہوا اور مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اس شخص کی بددعا نے جمہوریت کو غارت کیا اور میں کہتا تھا کہ میں نے بددعا نہین کی، البتہ اس کی جدائی سے میرا دل

بہت دکھ اور ذہنی وقلبی اذیت پہونچی۔

مولانا فارقلیط صاحب نے روزنامہ ''زمزم'' میں مجھے نائب مدیر بنانے کے وقت کہا تھا کہ آپ عالم ہیں، صحافت کو پیشہ مت بنایئے گا، یہ پیشہ طوائفوں کا ہے جیسے حالات اور جیسی پالیسی ہوتی ہے ویسا ہی لکھنا پڑتا ہے اور ضمیر پر دباؤ پڑتا ہے، البتہ عوام وخواص میں تعارف کے لئے کچھ دنوں یہ کام کیجئے، میں خود اپنی ''مولویت'' سے دست بردار ہونے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا، مدرسی اور تصنیف وتالیف میرا خاص ذوق تھا مگر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء کا تقریباً پورا دور صحافت ہی میں گذرا، درمیان میں وقفہ وقفہ سے مدرسی کی، مدرسوں سے تعلق رکھا، اور دوسرے مشاغل بھی رہے، اس کے باوجود الحمد للہ کہ میں نے جو راہ ابتداء میں اپنے علمی سفر کے لئے اختیار کی تھی، حالات کا مقابلہ کرتا ہوا اسی پر چلتا رہا۔ لاہور کا ماحول شعر وادب اور صحافت کا تھا، صرف مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ شیرانوالہ دروازہ کے ایک گوشے میں سلف صالحین کے انداز پر علمی اور دینی زندگی بسر کر رہے تھے اور قرآن حکیم کی تفسیر کی تعلیم دیتے تھے، وعظ وتبلیغ فرماتے تھے اور انجمن خدام الدین کی طرف سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتے تھے، نیلے گنبد کی مسجد میں مدرسہ اشرفیہ چل رہا تھا کبھی کبھی ان دونوں جگہوں پر حاضری ہوتی تھی۔

بمبئی میں اتنا بھی دینی وعلمی ماحول نہیں تھا، مسجدوں اور محفلوں میں مدرسہ عربیہ کے نام سے قرآن کی تعلیم ہوتی تھی، مسجد کے مؤذن وامام پڑھاتے تھے، جو عام طور سے باہر کے ہوتے تھے اور پیشہ کے طور پر کام کرتے تھے، مردہ نہلاتے تھے، فاتحہ، تیجہ، دسواں، چالیسواں کرتے کراتے تھے، مرغی ذبح کرتے تھے، دعا بھی کرتے تھے، اور ان سب کی فیس یا قیمت پاتے تھے، مولانا مفتی عبدالعزیز بہاری ایک چھوٹے سے کمرے میں مدرسہ امدادیہ جاری کئے تھے، جس میں عربی کی ابتدائی تعلیم بھی ہوتی تھی، ہر شہر میں کچھ مقامی مولوی اور عالم ہوتے ہیں مگر شہر بمبئی میں کوئی مقامی عالم نہیں تھا اور

نہ اب ہی ہے، یہ اس شہر کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے، باہر کے مولوی یہاں کمانے کے لئے آتے ہیں اور سیٹھوں سے رقم وصول کرنے کے لئے ہر جائز ناجائز کام کرتے ہیں، مدرسہ ہاشمیہ اور مدرسہ محمدیہ کسی نہ کسی انداز میں چل رہے تھے جو بعد میں اسکول بن گئے تھے، مقامی لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شہر تجارتی صنعتی اور کاروباری ہے، یہاں مولوی بنانے کے بجائے مولوی منگانے میں زیادہ فائدہ ہے، اسکول کالج میں پڑھ کر لڑکے کاروبار کریں گے مولوی بن کر کیا کریں گے، اس کے عوض صدقات وخیرات کا مزاج عام ہے، اس بارے میں بمبئی ہندوستان کے دیگر شہروں سے آگے ہے، بدعات وخرافات، دینی جہالت، پیر پرستی اور اوہام پرستی یہاں عام تھی، نیاز فاتحہ، میلاد شریف، صندل گاگر، عرس کا زور تھا، اور ان ہی خرافات کے حامل مولوی یہاں آ کر سیٹھوں سے رقم وصول کرتے تھے، اہلِ حق خال خال تھے، اور علمائے حق نے سخت حالات کا مقابلہ کر کے کچھ فضا صاف کی تھی۔

میں بمبئی تلاش معاش میں آیا تھا، اس کے ساتھ اپنی علمی حیثیت کو بچانا چاہتا تھا، اس لئے صحافت اور اخبار نویسی کو میں نے علمی اور دینی مشغلہ کے طور پر اختیار کیا اور پیشہ ور صحافی بننا پسند نہیں کیا، جواہر القرآن اور احوال معارف کے عنوان سے جمہوریت کے مضامین انقلاب میں لکھنا شروع کیا اور تین تین چار چار کالم روزانہ لکھتا تھا جن میں علمی، دینی، تاریخی، سیاسی مضامین ہوتے تھے، احادیث اور بزرگان دین کے واقعات اصلاحی انداز میں لکھتا تھا بڑی آزادی اور حوصلہ سے لکھتا تھا، عالم اسلام کے حالات اور اس پر تبصرہ لکھتا تھا، فقہی اور دینی مسائل کے جوابات بھی لکھتا تھا، الغرض احوال ومعارف کا کالم ہر قسم کی معلومات کا خزانہ ہوتا تھا، غزلیں اور نظمیں بھی ہوتی تھیں، اور عوام وخواص سبھی اس کو پڑھتے تھے، چند ہی دنوں کے بعد بمبئی کے مسلمانوں میں میرا اچھا خاصا تعارف ہوگیا، ابتداء میں مشاعروں میں بھی شریک ہوتا تھا اور سامعین بڑے احترام سے میرے اشعار سنتے تھے، تحت اللفظ سناتا تھا، ہر

مشاعرہ میں میری شرکت ضروری ہونے لگی، اور یہ بات میرے لکھنے پڑھنے میں حارج ہونے لگی تو بالکل ترک تعلق کرلیا، میرے مضامین کی وجہ سے انقلاب کو بڑا فروغ ہوا، عام طور سے لوگوں کا خیال تھا کہ ''انقلاب'' کی مقبولیت احوال ومعارف کے کالموں کی وجہ سے ہے، قدیم وجدید دونوں طبقے اس کالم کو پڑھتے پڑھاتے تھے، بہت سے لوگ تراشے کاٹ کاٹ کر رکھنے لگے، ۲۳/فروری ۱۹۵۱ء سے ۱۰/اپریل ۱۹۹۱ء تک چالیس سال سے زائد مدت تک میں نے انقلاب میں لکھا ہے اس کے مضامین کو الگ الگ عنوان سے سے مرتب کیا جائے تو بلا مبالغہ صدہا معیاری کتابیں تیار ہوسکتی ہیں، کبھی کبھی سوچتا تھا کہ یہ میری علمی محنت اور کاوش صرف ۲۴/ گھنٹے تک باقی رہتی ہے، اس کے بعد ضائع ہوجاتی ہے مگر پھر خیال آتا کہ اس سے مسلمانوں کی اصلاح اور دینی معلومات مقصود ہے جو حاصل ہورہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کالم نے قارئین انقلاب کو بڑی علمی اور دینی روشنی دی ہے اور اس سے مسلمانوں کو بہت فیض پہونچا ہے، یہی میرا مقصد تھا، ورنہ اس عظیم شہر میں اتنی معمولی تنخواہ پر کون یہ کام کرسکتا ہے، چالیس سال کے عرصہ میں ۱۵۰/روپیہ سے بڑھتے بڑھتے آخر میں چند ماہ پہلے پانچ سو روپیہ تنخواہ ہوگئی تھی، وہ بھی بلا طلب، کیونکہ میں نے کبھی علمی ودینی خدمت کے لئے مول بھاؤ نہیں کیا حالانکہ لوگ سمجھتے تھے کہ میرا مشاہرہ ہزار روپیہ کے لگ بھگ ہوگا، یوں بھی بمبئی کا مزاج استحصال کا ہے، جو شخص یہاں خلوص کا مظاہرہ کرتا ہے نقصان میں رہتا ہے، اور فن باز کامیاب رہتا ہے، ایک مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مجھ سے کہا کہ قاضی اطہر! تم بیوقوف ہو، یہاں مقالہ لکھنے آئے ہو، یہ کام یوپی میں جاکر کرو، یہاں تو حاجی ملنگ کی کرامتیں لکھواور پیسے کماؤ

مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی کا اجراء (۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء):۔ مولویت کا مزاج لاہور جیسے رنگین شہر میں نہیں بدلا، بمبئی آکر اس کی حفاظت کا احساس اور شدید ہوگیا، اب دنیا کمانے کے مواقع پیدا ہونے لگے تھے مگر ان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی

البتہ بمبئی میں یو پی کے طرز کا مدرسہ جاری کرنے کی فکر ہوئی، ''انقلاب'' میں آنے کے بعد یہ خیال اور پختہ ہوا، اتفاق کہ اسی زمانہ میں ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں بھیمڑی (بھیونڈی) جانا ہوا، جہاں اعظم گڈھ بلکہ مبارکپور اوراس کے حدود کے متعدد خاندان آباد اور خوشحال تھے،۔اس کے بعد بعض کاموں کے سلسلہ میں بار بار جانا ہوتا تھا اور یہاں مدرسہ جاری کرنے کا ارادہ ہوا، پہلے تو بھیمڑی کے لفظ سے مجھے وحشت ہوتی تھی اوراس کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا مگر ایسا ہوا کہ یہی مقام میرے مقصد کا مظہر بنا، یہاں دو بزرگ حاجی ولی اللہ جان محمد جہانا گنجی اور حاجی محمد صابر خیرآبادی پوری بستی میں اپنے دینی ذوق میں نمایاں تھے، حاجی ولی اللہ صاحب کے یہاں میرا آنا جانا ہوتا تھا، ان دونوں کے مشوروں سے دوسروں کو تیار کیا اور بڑی مشکل سے دوسرے لوگ راضی ہوئے ، اور ماسٹر حاجی محمد مبین ، اور حاجی عبدالغنی رحیم اللہ نے بھی تعاون کیا، چنانچہ ۱۱/ جمادی الثانیہ ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۱ء) کو ایک کمرے میں مفتاح العلوم کے نام سے ایک مکتب کا افتتاح ہوا، اور صفر ۱۳۷۴ھ میں ھندوستانی مسجد میں اس کے لئے شاندار عمارت کی بنیاد رکھی گئی، اور یہ مدرسہ عظیم الشان علمی و دینی قلعہ بن گیا ہے اور میری نگرانی میں چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، بمبئی میں کھانے میں جو رقم لگتی وہ بھیمڑی کی آمد و رفت میں خرچ کرتا تھا اور وہاں مہمان بن کر دو ایک دن رہتا تھا، اس طرح ایک زمانہ تک آتا جاتا رہا، اس راہ میں مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لوگ دیکھ کر وہابی وہابی چلاتے تھے، مارنے کے لئے آتے تھے، مخالفت کرتے تھے، میں تالیف و مصلحت سے کام لیتا تھا حتیٰ کہ محرم کا کھچڑا جا کر کھاتا تھا تاکہ مخالفت کم ہو، عجیب حالات تھے،

میرے دوست مولوی محمد یٰسین ابراہیم پوریؒ اس کے پہلے مدرس ہوئے، وہ بمبئی میں تھے وطن آنے کے لئے ٹکٹ خرید لئے تھے میں نے ٹکٹ واپس کرا کر ان کو وہاں رکھا،

عبد الصمد شرف الدین سے تعلق:۔ بھیمڑی میں شرف الدین الکتبی واولادہ بمبئی کے صاحبزادے مولانا عبدالصمد شرف الدین اہلحدیث عالم وفاضل تھے ،دارالقیمہ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کرکے **المعجم الفہرست** اسی سے چھاپ رہے تھے، بڑے نفاست پسند، خشک اور بااصول عالم ہیں، رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کے ماموں ہیں،اورسعودی عرب سے ان کا خاص خاندانی تعلق ہے، ان سے اس زمانہ میں تعلقات ہوئے ، وہ میرا بہت لحاظ پاس کرتے تھے،ان کے صاحبزادے عبدالواحد مرحوم بھی باپ کی طرح پیش آتے تھے، انھوں نے امام مِزّیؒ کی ''**تحفۃ الاشراف فی الاطراف**'' دس جلدوں میں نہایت اہتمام سے چھاپی ، یہ تمام جلدیں مجھ کو مولوی عبدالرزاق سعید میمن مرحوم نے تحفۃً عنایت کیں،اسی دارالقیمہ سے ''**سنن النسائی الکبریٰ**'' بھی اسی اہتمام سے شائع ہونے لگی ، اس کی دو جلدیں مرحوم عبدالواحد نے مجھے دیں تیسری جلد کی طباعت کے دوران ان کا انتقال ہوگیا،اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

حیات النبی کو بمبئی بلایا:۔ اسی دور میں اپنے چھوٹے بھائی قاضی حیات النبی مرحوم کو بمبئی بلایا، وہ خوشحالی کے دور میں پیدا ہوا تھا، ناز ونعمت میں پروان چڑھا تھا ، فطرۃً ضعیف وناتواں تھا ، مزاج میں تیزی تھی ، بڑا کام نہیں کرسکتا تھا ، ذہین، معاملہ فہم اور صاف گو تھا، اس زمانہ میں رامپور کے ایک علامہ شرف زیدی نے بمبئی سے ایک روزنامہ ''مشعل'' کے نام سے جاری کیا ،اسی میں کتابت کے لئے حیات النبی مرحوم کو ۶/آنے فی کالم رکھ دیا، حالانکہ وہ پہلے سے کتابت نہیں جانتا تھا، چند ماہ میں ''مشعل'' بند ہوگیا تو اس کو وطن واپس کردیا ،اور بعد میں ''البلاغ'' میں مستقل کاتب بن کر میرے ساتھ رہا اور حج وحجاج کی پیش بہا خدمات انجام دیں اور پانچ مرتبہ حج وزیارت سے مشرف ہوا۔

میری تیسری کتاب ''مسلمان'':۔ میری تیسری کتاب ''مسلمان'' جمعیۃ

المسلمین جنجیرہ نے دسمبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۳۷۲ھ میں بڑے اہتمام سے شائع کی اور کوکن کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کیا، مجھے بمبئی آئے ہوئے تین سال گذر چکے تھے اور شہرت ومقبولیت عام ہو چکی تھی، جمعیۃ المسلمین جنجیرہ (بمبئی) نے بارہا میرے تبلیغی اصلاحی دورے کا اہتمام کیا اور میں کوکن کے مختلف علاقوں میں آیا گیا، اسی مناسبت سے میری کتاب ''مسلمان'' شائع کی، اور اس کو اصلاحی کتب کی اشاعت کا پہلا اقدام بتایا، مقدمہ میں اراکین نے لکھا:

''جمعیۃ کے محسن مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نائب مدیر روزنامہ انقلاب بمبئی کے ہم بیحد ممنون ومشکور ہیں کہ جناب موصوف نے جمعیۃ کی درخواست پر اس مختصر لیکن مفید رسالہ کو بڑی کاوش اور محنت شاقہ سے مرتب فرمایا، اور جمعیۃ کے اصلاحی رسالوں کی اشاعت کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں بسم اللہ کرنے کی سعادت سے مشرف کیا، خدائے قدیر جناب موصوف کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے، اور جمعیۃ کو اس رسالہ کی اشاعت سے مذکورہ بالا مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے، آمین''

اور مولانا حکیم اعظمی صاحب نے ''عنوان حدیث'' کے ذیل میں لکھا:

''اس رسالہ کے مرتب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کے فکر ومطالعہ کا محور اسلام ہے، اس سے پہلے آپ کی تصانیف میں سے اسلامی نظام زندگی اور افادات حسن بصریؒ شائع ہو چکی ہیں، اور ملک ان سے استفادہ کر رہا ہے، ان کے علاوہ آپ کی اور بھی اردو، عربی کی کتابیں زیر ترتیب ہیں، ان میں ''رجال السند الہند'' (عربی) اسلامی ہند کے قدیم رجال کی بیش بہا تاریخ ہے، موصوف کی علمی وفکری صلاحیت اور طبعی وذہنی سلامت روی نے ادھر دو تین سالوں سے صوبہ بمبئی کے مسلمانوں میں بہت کچھ دینی اور ملّی بیداری پیدا کر دی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج بمبئی کا تقریباً ہر پڑھا لکھا طبقہ آپ کے علمی وفکری مقام سے اچھی طرح واقف ہے، میری دعا ہے کہ جس طرح آپ کے

علمی و دینی ، اسلامی و تاریخی مقالات سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچ رہا ہے ،
اسی طرح اس ٹھوس اور اہم کتاب سے بھی فائدہ ہو اور مسلمان اس پر عمل کر
کے اپنے اندر اسلامی زندگی پیدا کریں‘‘

اور میں نے اس کے ابتداء میں لکھا:

’’اگست ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور کو خدا حافظ کہنا پڑا اور اسکے دوسال بعد جمعہ ۲۸/ذوالحجہ ۱۳۶۸ھ کو عروس البلاد بمبئی میں آنا ہوا ، اب ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ہے ، اس سوا تین سال کی مدت میں بمبئی اور اس کے اطراف کے اکثر و بیشتر مقامات پر آنے جانے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ، ان میں دیار کوکن اور ان کے ساکنانِ جنات در کنار کی کشش کے ظاہر رسم وراہ سے گذر کر قلبی اور دینی علاقہ استوار کر دیا ہے ، زیرِ نظر رسالہ بھی اسی علاقۂ مؤدت واخوت کا ایک ثبوت ہے جسے جمعیۃ المسلمین جنجیرہ کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے اور عامۃ المسلمین خصوصیت سے مسلمانان کوکن اس کے مخاطب ہیں‘‘

اس رسالہ کو اللہ تعالیٰ نے بری مقبولیت دی ، اور اب تک چار مرتبہ اس کی اشاعت ہو چکی ہے ، سب سے پہلے ساجد لکھنوی نے چھاپ کر شائع کیا ، پھر میں نے انجمن اسلام ہائی اسکول میں معلّمی کے زمانہ میں وہاں کے طلبہ کے لئے شائع کیا ، اور اس کے بعد مدرسہ دینیہ غازی پور ، ویلفیر اکیڈمی مبارکپور ، اور جمعیۃ علماء ہند دہلی نے مشترکہ طور پر چھاپ کر شائع کیا ۔

قادری صاحب سے تعلق:۔ بمبئی جانے کے بعد جن لوگوں سے تعلقات ہوئے ، ان میں ہمارے محترم ومکرم جناب سید محمد صدیق صاحب قادری مہر مُہسلائی سب سے زیادہ قریب ہوئے جیسے ہم لوگ ایک خاندان کے ہیں ، میں بمبئی میں نیا نیا گیا تھا ، عید میلاد النبی کے ایک جلسہ کے سلسلہ میں جناب محمد بیگ چغتائی مرحوم کے ساتھ کوکن کے مقام شری وردھن گیا ، یہ سفر جہاز کے ذریعہ ہوا ، واپسی پر رات میں

بندرگاہ پر ایک جوان، نیک سیرت آدمی سے ملاقات ہوئی، اور پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوگئے، یہ جناب سید محمد صدیق صاحب قادری مہر مُہسلائی انڈر سکریٹری حکومت مہاراشٹر تھے، واپسی ساتھ ہوئی بعد میں وہ جمعیۃ علماء کے دفتر میں ملنے کے لئے آئے اور میں ان کے ساتھ ان کی قیام گاہ پر گیا، اس دن سے آج تک ہمارے تعلقات حد درجہ شگفتہ اور مخلصانہ ہیں، طے ہوا کہ میں ہر جمعہ کو ناشتہ کے لئے ان کے یہاں آیا کروں، اس طرح ملاقات ہوتی رہے گی، چنانچہ اس وضعداری کو دونوں نے ہر حال میں نبھایا، اس کے بعد یہ تعلق میرے بھائی حیات النبی سے اور میرے لڑکوں سے ہوا اور سب لوگ ایک خاندان کے افراد معلوم ہونے لگے، قادری صاحب کا وطن کوکن کا مقام مُہسلہ تھا جو نوابان جنجیرہ کا ایک تعلقہ تھا، مگر قادری صاحب نہایت باذوق شاعر تھے اور یوپی والوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں، اس تحریر سے چار دن پہلے ان کا خط آیا کہ ان کی اہلیہ محترمہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو انتقال کر گئیں، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔

ماسٹر الحاج سید محی الدین صاحب:۔ بالکل ابتدائی دور میں جن حضرات سے تعلق ہوا اور چالیس بیالیس سال سے اب تک نہایت خلوص کے ساتھ قائم ہے ان مین ہمارے محترم اور بزرگ ماسٹر الحاج سید محی الدین صاحب (سارین، اعظم گڈھ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان کا آبائی وطن املو ہے، پیرزادہ خاندان سے ہیں، اس وقت وہ بمبئ میں اردو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، خاندانی آدمی ہیں، میں جس زمانہ میں کھانڈا محلّہ خان منزل کے اوپر رات کو مفتاح القرآن پڑھاتا تھا وہ بھی پڑھنے آتے تھے، حالانکہ وہ ہیڈ ماسٹر تھے، ہم دونوں میں مزاج کی ایسی ہم آہنگی تھی کہ اس وقت کے وہ میرے مونس و غمخوار تھے، راتوں کو بمبئ کے ساحلوں کی سیر کراتے تھے، میں ان سے اور وہ مجھ سے بیحد مانوس تھے، آج تک ان سے خاندان کی طرح تعلق ہے، میری طرح وہ بھی وطن ہی میں رہنے لگے اور جانبین سے آمدورفت اور دید

وملاقات جاری ہے، الحمدللہ

مدرسہ احیاء العلوم کے چندہ کی ابتداء:۔ بمبئی جانے کے بعد مدرسہ احیاء العلوم کے لئے وہاں چندہ کرنے کا خیال پیدا ہوا اور مدرسہ کے نائب ناظم مولانا شمس الدین صاحب حسینی سے اس کے بارے میں بات ہوئی، چنانچہ وہ رمضان میں اس کام کے لئے بمبئی پہونچے اور ہم دونون نے مدرسہ کے لئے چندہ کی کوشش شروع کی، راتوں کو لوگوں سے مل کر چندہ وصول کرتے تھے، اس کیلئے بھمڑی بھی آنا جانا ہوتا تھا، ان تھک کوشش کے بعد آہستہ آہستہ کام بڑھتا رہا یہاں تک کہ یہ سلسلہ مالیگاؤں، دھولیہ، برہان پور اور ناگ پور وغیرہ تک پھیل گیا، ان علاقوں کی جو فصلیں کٹ کر آج بھی احیاء العلوم میں آرہی ہیں، وہ سب ہمارے بنائے ہوئے کھیت کی ہیں، دیہاتی مثل ہے، ''کمائے دھوتی والا کھائے ٹوپی والا''

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے　　　　یہ سب پودا ن ہی کی لگائی ہوئی ہے

مرحوم احمد غریب اور انجمن خدام النبی سے تعلق:۔ ابتدائی دور میں حکیم اعظمی صاحب مرحوم ایک شخص کی ملاقات کیلئے مینارہ مسجد کے سامنے فینسی محل میں گئے، مجھے بھی ساتھ لے لیا، وہ صاحب بڑے تپاک سے ملے، چائے وغیرہ پیش کی اور دونون میں کچھ باتیں ہوئیں، واپسی پر حکیم صاحب سے میں نے پوچھا کہ یہ کونی ہیں یا میمن؟ تو بتایا کہ میمن جماعت کے نہایت مخیرؒ، اور مذہبی آدمی احمد غریب ہیں، یہ احمد بھائی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

یہ چار بھائی علی الترتیب محمد، احمد، حافظ محمد صدیق اور عبدالکریم تھے، جامع مسجد کے پاس ان کی کٹلیری کی بہت بڑی دوکان تھی ۱۹۴۴ء سے مکہ مکرمہ میں شارع فیصل پر بھی ان کی کٹلیری وغیرہ کی دوکان تھی، چاروں بھائی عربی زبان سے واقف تھے، میمنی، اردو، انگریزی اور عربی سب زبانوں سے واقف تھے، علمائے حق سے تعلق رکھتے تھے اور میمنوں میں کھلے ہوئے موحد و حق پرست تھے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

کے خاص معتقد تھے،ان سے غائبانہ عقیدت تھی،مولانا بھی ان سے غائبانہ تعلق رکھتے تھے،احمد بھائی ان کے مضامین کا ترجمہ ''میمن ویلفیر'' اخبار میں لکھتے تھے،مولانا علی میاں سے بھی عقیدت تھی،صابوصدیق مسافرخانہ میں انجمن خدام النبی کے سکریٹری تھے،بلکہ روح رواں تھے اورحجاج کی ہرطرح خدمت کرتے تھے،حج کمیٹی کے ممبر تھے ،اور بمبئ کے دینی وملّی کاموں میں بڑھ چڑھ کر مالی تعاون کرتے تھے،۱۹۵۵ء میں دینی تعلیمی کونسل کا اجلاس ان ہی کی کوشش اور مالی تعاون سے ہوا تھا،ان حضرات کا وطنِ ثانی گویا مکہ مکرمہ تھا،اس وقت وہاں کی حکومت کے ارکان سے خصوصی ربط ضبط اور اثر تھا، احمد بھائی سے اس ملاقات کے بعد غالبًا پھر ملنا نہیں ہوا اور جب'' جمہوریت'' کا اجراء ہواتو مجھ کواور غازی صاحب کوانھوں نے انجمن خدام النبی کے شعبۂ نشرواشاعت سے منسلک کر کے مراسلت وغیرہ شائع کرانے لگے،اور جب میں وطن واپس آنے لگا تو احمد بھائی نے مجھے ایک سوروپیہ دیا، میں نے اس روپیہ سے پانی کی مشین لگائی جس کواس زمانہ میں اعظم گڈھ سے والد مرحوم کے ساتھ جاکر غالبًا ۹۳/روپیہ میں لایا تھا،یہ مشین آج بھی کام دے رہی ہے۔

__''البلاغ'' کا اجراء__:۔اس کے بعد جمعہ ۹/رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ ،۱۴/مئی ۱۹۵۴ء کو ہفتہ وار ''البلاغ'' کا اجراء ہوا،اسی کے ساتھ ماہنامہ ''البلاغ'' کی تاسیس بھی ہوئی،اوردوسرے دومدیروں کے ساتھ میں بھی ادارت میں شریک کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد دونوں مدیروں نے ترک تعلق کرلیا اور میں نے تقریباً ۲۶/سال تک ''البلاغ'' کا مدیرتحریررہ کراس کو جاری رکھا،ہم لوگوں کو ۵۰/روپیہ ماہوار البلاغ سے ملتا تھا،ایک مرتبہ مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت پڑی، میں نے احمد بھائی سے قرض کے طور پر طلب کیا اورانھوں نے مطلوبی رقم فوراً دیدی،اسی کے ساتھ پوچھا کہ آپ عربی پڑھا سکتے ہیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ بمبئ کے باہری مولویوں کی طرح مین بھی چالو مولوی ہوں اور مضمون وغیرہ لکھ لیتا ہوں، میں نے کہا کہ میں عربی زبان کا ادیب

ہوں، فلاں فلاں مدرسہ میں تدریسی خدمت کر چکا ہوں، میں ہر قسم اور ہر فن کی چھوٹی بڑی کتاب پڑھا سکتا ہوں، انھوں نے کہا کہ کل صبح آٹھ بجے سے نو بجے تک آکر ہم لوگوں کو پڑھایئے، چنانچہ میں نے چاروں بھائیوں کر ''ریاض الصالحین'' پڑھانی شروع کی، ایک طرف چاروں بھائی بیٹھ کر مجھ سے حدیث پڑھتے دوسری طرف ان کے لڑکے بچے ایک حافظ وقاری سے قرآن اور تجوید کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور ایک کمرہ میں مکتب و مدرسہ دونوں جاری رہتے تھے اور گھر کے بچے بڑے سب پڑھتے تھے، ان کی والدہ بڑی عابدہ زاہدہ اور نیک دل خاتون تھیں، لڑکوں کو بھی اپنے جیسا بنایا تھا، اب مجھے مہینہ میں سو روپیہ ملنے لگا جو البلاغ کی ادارت اور گھر کی تعلیم کے عوض میں تھا یوں ہی وظیفہ تھا، یہی مشاہرہ آخر تک باقی رہا، نہ میں نے کبھی کچھ کہا اور نہ ہی ان حضرات نے اس کی طرف توجہ کی، مگر اس کے باوجود ان کی ذات سے مجھے بے حد علمی فائدہ ہوا اور وہ لوگ میرے محسن اعظم ہیں جیسا کہ معلوم ہوگا، ان کے پاکستان جانے کے بعد تک یہ تعلیمی سلسلہ جاری رہا، دومرتبہ ''ریاض الصالحین'' پڑھائی، صحیح مسلم کا ایک خلاصہ پڑھایا، اور المنتقیٰ ابن جارود پڑھائی، اور بعض دوسری حدیث کی کتابیں پڑھائیں۔

اس محمد احمد برادرس اور انجمن خدام النبی نے مجھ کو ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں پہلی بار حج وزیارت کی سعادت دلائی، اور مکہ مکرمہ میں ان ہی کے یہاں قیام رہا، ہر طرح آرام پہونچایا، اس کے بعد ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۸ء میں پانچ ہزار روپیہ سے زائد خرچ کر کے میری کتاب ''رجال السند والہند'' طبع کرائی، جس سے ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں میں میرا تعارف ہوا، اور اوساط علمیہ میں باوقار مقام نصیب ہوا، پاکستان جانے کے بعد بھی میرے ساتھ ان کا تعلق باقی رہا، انھوں نے بمبئی میں مشہور احمد بن عمر آئل مِل کے مالک اور ان کے رشتہ دار جناب عبد الستار سیٹھ سے میرا تعارف و تعلق پیدا کرادیا، جن کی توجہ وعنایت ان کے انتقال ۱۹۹۰ء تک رہی، اور جب

۱۴۰۱ھ میں الجامعہ الحجازیہ مبارکپور میں جاری کیا تو حافظ محمد صدیق صاحب کے صاحبزادے عزیزی حافظ محمد امین مقیم مکہ مکرمہ نے اپنے والد مرحوم کی طرف سے مدرسہ میں حجازی مسجد تعمیر کرائی، اس میں تمام تر سرمایہ ان ہی کا لگا ہے، اس کے علاوہ مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں مبارکپور آئے، ان باتوں کی تفصیل اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔

مولوی محمد عثمان صاحب بمبئی میں:۔اس دوران مولوی محمد عثمان صاحب دوبار بمبئی آئے اور دونوں بار انجمن خدام النبی میں آفس انچارج کی حیثیت سے کام کیا، پہلی بار زیادہ دن تک نہیں رہ سکے، دوسری ۱۳۷۷ھ، ۱۹۵۸ء میں کافی مدت رہے، اور یہیں سے معہد ملت مالیگاؤں گئے اور وہاں سے مدرسہ سراج العلوم دھولیہ میں کافی دن تدریسی خدمت انجام دی۔

رجال السند والہند کی جمع و ترتیب:۔انقلاب اور البلاغ میں لکھنے کے ساتھ مشاعروں اور جلسوں میں بھی شریک ہوتا تھا، مگر بہت جلد مشاعرہ بالکل ترک کر دیا اور جلسوں میں بھی جانا بہت کم کر دیا کیونکہ ان باتوں میں باتوں میں وقت ضائع ہوتا تھا اور شہرت و ناموری کی ہوس میں علمی ذوق ختم ہوسکتا تھا جس کیلئے میں نے بچپن ہی سے بہت محنت کی تھی، اب فرصت کے اوقات میں رجال السند والہند کی تالیف و جمع و ترتیب میں لگ گیا، صبح دس بجے سے دو بجے تک ابناء مولوی محمد بن غلام سورتی تاجر کتب جاملی محلّہ میں بیٹھ کر تاریخ و رجال اور طبقات کی کتابوں سے سندی و ہندی رجال کے حالات جمع کرتا تھا، اسی طرح شرف الدین الکتبی واولادہ تجار الکتب محمد علی روڈ کے یہاں مستقل طور سے بیٹھ کر کتابوں سے استفادہ کرتا تھا، دونوں کتب خانوں میں اس سلسلہ کی جو کتاب ہوتی تھی، میں سرسری طور سے دیکھ کر اپنے مطلب کی بات نقل کر لیتا تھا، ان کے مالک میرے ساتھ نہایت محبت اور تعاون کا سلوک کرتے تھے، بعض اوقات کتابیں کمرے میں بھی لا کر نقل کرتا تھا، ان دونوں

کتب خانوں سے میں نے خوب خوب استفادہ کیا، اسی کے ساتھ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ محمد یہ سے بھی استفادہ کرتا تھا اور محترم سید محمد قادری صاحب کے توسط سے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری کے عربی پروفیسر مرحوم احمد بہاء الدین داورکر صاحب کے ذریعہ کتب خانہ سے جغرافیہ کی قدیم کتابیں ''المسالک والممالک'' ابن خرداذبہ'' مسالک الممالک'' اصطخری، ''احسن التقاسیم'' مقدسی بشاری،'' مسالک الابصار'' فضل اللہ عمری اور لائڈ کی مطبوعہ دیگر کتابیں لاکر ان سے نقل کرتا تھا، پروفیسر داورکر صاحب عربی انگریزی کے عالم تھے، بعد میں ان سے بہت سے انگریزی مضامین کا ترجمہ استاد احمد فرید یمانی کیلئے کرایا، ان سے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔

سلطان مُکلّا:۔ میں جن زمانہ میں ابناء مولوی محمد بن غلام سورتی کے کتب خانہ میں بیٹھا کرتا تھا، اس کے مالک عبدالعزیز تھے اور ان کے والد مولوی عبدالستار صاحب تقریباً اسی سال کے نہایت بزرگ جہاندیدہ آدمی تھے، اسی اثناء میں ایک مرتبہ ان کے یہاں مُکلّا کے سلطان (غالباً نام) غالب قعیطی اپنے ملازموں کے ساتھ آئے، وہ حیدرآباد میں رہتے تھے، اور کتبخانہ والوں سے ان کا پہلے سے تعارف و تعلق تھا، انھوں نے ایک کتاب کسی دینی موضوع پر لکھی تھی مولوی عبدالستار صاحب نے ان کی کتاب پر مجھ سے عربی میں مقدمہ لکھوایا، ایک مرتبہ شادی کے سلسلہ میں ان کے وطن سورت بھی گیا تھا، حضرت مولانا ابوالوفاء افغانیؒ حیدرآباد سے آتے تو ان ہی کے یہاں قیام کرتے تھے اور میری ملاقات ہوتی تھی، مولانا افغانی سے میرے علمی تعلقات بہت گہرے تھے، حیدرآباد ان کا مہمان بننے کا شرف بھی مجھے حاصل ہے۔

ان کتب خانوں کے علاوہ سفر حضر میں جہاں کوئی ایسی کتاب مل جاتی جس میں میرے موضوع کی کوئی بات ہوتی تو فوراً اسے نقل کر لیتا تھا تاکہ کتاب جلد سے جلد مرتب ہوسکے۔

بعد میں ان تمام اقتباسات کو ترتیب کے ساتھ کتابی شکل میں جمع کیا جو میرے

پاس دو ضخیم کتاب کی شکل میں موجود ہے اور اس کے علاوہ جغرافیائی اقتباسات علیحدہ علیحدہ کاپی میں محفوظ ہیں، جن سے اب تک کام لیتا ہوں۔

مولانا محمد اسحاق بنارسیؒ:۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد اسحاق بنارسیؒ بہ سلسلۂ تجارت بمبئی آئے اور مسافر خانہ کے پاس الکریم منزل مین رہائش اختیار کی، ان سے لاہور میں خاص تعلق پیدا ہو چکا تھا جب وہ اپنی کتاب کلمات اکابر کی طباعت میں میرے یہاں مہینوں مقیم رہے، ان کے والد مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب نانا مرحوم کے خاص شاگرد تھے، اس وجہ سے اور بھی تعلق تھا، مولانا محمد اسحاق صاحب بڑے نفاست پسند، باذوق، احباب نواز اور مجلسی تھے، ان کے یہاں رات دن لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا، جب تک وہ بمبئی میں مقیم رہے، اہل علم وفضل کا مرجع بنے رہے، ان کی مجلسیں بمبئی کی یادگار مجلسیں ہیں، عربوں سے بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، اس لئے عرب بھی وہاں آیا کرتے تھے، مدتوں ان کی عدم موجودگی میں ان کا کمرہ میرے قبضہ واستعمال میں تھا، ویسے میں ان دنوں مدن پورہ میں احمد بلڈنگ میں رہتا تھا مگر صبح وشام دفتر البلاغ اوران کے یہاں آنا جانا رہتا تھا، اور بعد میں میں بھی 153 جنجیکر اسٹریٹ میں چلا آیا تو گویا ساتھ ہی رہنے لگا۔

استاذ احمد فرید یمانیؒ:۔ بمبئی میں عربوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، ان کی آمدورفت بھی رہا کرتی تھی، بمبئی کی زبانوں میں عربی بھی ایک زبان تھی، یہاں کے مقیم عربوں اور آنے والے عربوں کے علاوہ سفارت خانوں کے ذمہ داروں سے بھی ملاقات رہتی تھی، ان میں یمن کے استاذ احمد فرید یمانیؒ سے خاص تعلق تھا، یہ اور محمد علی بجاش دونوں مسافر خانہ کے پاس جونا بنگالی پورہ میں ''محلات الفرات '' کے نام سے ایک فرم کے ذریعہ یہاں سے عرب کے ممالک میں مال بھیجتے تھے، استاذ احمد فرید بخاریؒ سیاسی اور علمی آدمی تھے، تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر کتب بینی اور مطالعہ خوب کرتے تھے، عربی میں مضمون لکھتے تھے، میں اردو میں ترجمہ کر کے چھاپتا تھا، بعض کو صاف کرتا

جس کو وہ عربی اخبارات میں شائع کراتے تھے، ان کے ذریعہ مجھے کئی نادر و نایاب کتابیں ملیں، دولت کویت کے شعبہ ''التراث العربی'' سے شائع کتاب ''التحف والذخائر'' انھوں نے مجھے دی، اور میں نے براہ راست اس شعبہ سے خط و کتابت کی جس کے نتیجہ میں وہاں کی نادر و نایاب مطبوعات میرے پاس ہدیہ و تحفہ کے طور پر آنے لگیں بلکہ وہاں کے ذمہ داروں نے مجھ کو علمی مشیر بنالیا تھا، استاذ احمد فرید یمانیؒ ۱۹۹۰ء میں بمبئی میں انتقال کر گئے، اللہ مغفرت کرے، ان سے اور ان کے بال بچوں سے میرا خصوصی تعلق تھا ان کی بیوی ایک کوکنی خاتون ہیں، میرے حال پر بہت مہربان تھے۔

مولانا غلام محمد خطیب جامع مسجد بمبئی:۔ مولانا غلام محمد خطیب وامام جامع مسجد بمبئی نہایت نیک، خاموش اور دینی معاملات میں متشدد تھے، تقویٰ وطہارت میں بے مثال اور خوش خلقی و شرافت کا پیکر تھے، انگریزی میں ایم، اے تھے، کسی زمانہ میں بمبئی کے ایک کالج میں پروفیسر تھے، جناب محمد علی زینل علی رضا جوہری کے مکہ مکرمہ کے مدرسۃ الفلاح میں چھ سال تک درس دے چکے تھے، علمائے حق کے معتقد اور آخر میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے دست گرفتہ تھے، ان سے ابتدائی چند مہینوں میں ''یاد اللہ'' ہوگئی تھی، خاص طور سے کوکن کے اصلاحی اسفار کی وجہ بہت قربت ہوگئی وہ بھی اسی علاقہ کوکن کے تھے، وہ میری قیام گاہ کے قریب ہی رہتے تھے میں ان کے یہاں صبح کو اکثر جایا کرتا تھا، اور بہت احترام و تکریم سے پیش آتے تھے، ان کے ذریعہ کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد سے کتابیں لاکر پڑھتا تھا اور اقتباس لیتا تھا، ''معجم البلدان'' ''کتاب الکنیٰ'' دولابی ان کے ذریعہ کتب خانہ سے لاکر پڑھتا تھا، اور ان ہی کے ذریعہ ''تاریخ اسماء الثقات'' لابن شاہین کا نادر و نایاب نسخہ لاکر نقل کیا اور بعد میں اس کو تعلیق و تصحیح کے بعد شائع کیا، اسی طرح ''جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول'' کا قلمی نسخہ کتب خانہ محمدیہ سے ان کے ذریعہ لایا اور اپنے نسخہ سے مقابلہ

کر کے شائع کیا۔

ایک مرتبہ انھوں نے تفسیر بیضاوی کے کچھ مقامات پر اشکال کیلئے مجھ سے کہا تو میں نے پہلوتہی کی، انھوں نے کہا کہ بمبئی میں کون عالم ہے جس سے رجوع کیا جائے، ان کے کتب خانہ میں بیٹھ کر کئی دن تک وہ مقامات حل کئے گئے، چند سال ہوئے وہ بھی انتقال فرما گئے، رحمہ اللہ، وہ میرے بمبئی کے مخلص علمی معاونین میں تھے۔

''البلاغ'' کا تعلیمی نمبر (۱۹۵۴ء):۔ ۸،۹؍جنوری ۱۹۵۵ء میں آل انڈیا تعلیمی کنونشن کا اجلاس صابوصدیق مسافر خانہ بمبئی میں بڑے شاندار طریقہ پر ہوا، داعی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند اور منتظم الحاج احمد غریب صاحب سکریٹری انجمن خدام النبی تھے، اس موقع پر مجلّہ ''البلاغ'' کا شاندار تعلیمی نمبر ۴۳۲ صفحات کا شائع کیا گیا، جو ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، جمادی الآخریٰ ۱۳۷۴ھ، دسمبر ۱۹۵۴ء جنوری، فروری ۱۹۵۵ء پر مشتمل تھا، اس کی تیاری میں میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور طول طویل مضامین لکھے، خاص طور سے ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' ''استشراق اور مستشرقین'' بہت محنت سے لکھے تھے، جن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں ان دونوں مقالوں کے بارے میں اپنی قیمتی رائے ظاہر کی اور لکھا کہ: ان میں ''مسلمانوں کے ہر پیشہ اور ہر طبقہ میں علم اور علماء'' کو پڑھ کر اچھے اچھے پڑھے لکھوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں'' ان کے علاوہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی تاریخ لکھی اور کتابوں پر تبصرہ بھی لکھا۔

البلاغ کا یہ نمبر ہندو پاک کی علمی و دینی تعلیم کے سلسلہ میں ماخذ بن گیا اور غیر ممالک سے اس کی طلب آنے لگی، یہ نمبر مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کا ریکارڈ ہے جو گذشتہ اور موجودہ صدی کا آئینہ دار ہے۔

معارف القرآن کی اشاعت:۔ اخبار انقلاب میں لکھتے ہوئے چار پانچ سال بیت چکے تھے، میں بڑے ہمت و حوصلہ سے لکھتا تھا اور ہر قسم کی دینی، علمی،

تاریخی، سیاسی معلومات قارئین کے لئے فراہم کرتا تھا، عوام وخواص ان کالموں کی اور میری جس قدر تعریف کرتے تھے اسی قدر میرا یہ احساس بڑھتا جاتا تھا کہ میری محنت ضائع ہورہی ہے اوران گراں قدر مضامین کی مدت بہت کم ہے، یہ ضائع ہورہے ہیں، اخبارات کے مضامین وقتی طور سے پڑھے جاتے ہیں، حالانکہ یہ خام خیالی تھی کیونکہ اس سے میرا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اوران کی دینی خدمت تھی، اسی احساس کے ماتحت میں نے جواہر القرآن کا انتخاب کرکے ایک کتاب معارف القرآن کے نام سے ۱۳۷۶ھ، ۱۹۵۶ء میں شائع کی، جو ۱۲۵؍صفحات پر مشتمل تھی، جس کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے ''صدق'' میں لکھا: قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک کہنہ مشق، صاحب قلم ہیں، بمبئی کے اخبارات وجرائد میں ان کے قلم سے دینی، اسلامی، اصلاحی، عنوانات پر مضامین سالہاسال سے نکل رہے ہیں، یہ ان کے اسی قسم کے مختصر مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر مضمون کا تعلق قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ہے، توحید، رسالت، کتاب اللہ اور دینی زندگی نظر آئے، قرآن مجید کی جو خدمت بھی خواہ کسی درجہ کی ہو اخلاص کے ساتھ کی جائے مستحق اجر ہوتی ہے، اوراس کتاب کے مصنف اجر کے حقدار تو بہر حال ہوچکے، حالات حاضرہ پر اشارے مصنف جابجا کرتے گئے ہیں، جو اکثر صورتوں میں مفید ہیں اور پُر لطف بھی، مثلاً الــــــخ (صدق ۵؍ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ۔ ۹؍نومبر ۱۹۵۶ء)

<u>البلاغ شاہ سعود نمبر</u>:۔ ۱۳۷۵ھ، ۱۹۵۵ء میں جلالۃ الملک سعود الاول ہندستان تشرف لائے، یہ حرمین کے پہلے حکمراں تھے جو ہندستان آئے اوران کے جود وسخا کی دھوم پورے ملک میں مچ گئی، حاتم کی یاد تازہ ہوگئی، بمبئی میں ان کی آمد کے موقع پر انجمن خدام النبی نے اتوار ۱۱؍دسمبر ۱۹۵۵ء کو ان کے اعزاز میں شاندار استقبالیہ جلسہ مسافر خانہ میں کیا، اس موقع پر البلاغ کا ''سعود نمبر'' ربیع الآخر، جمادی الاولیٰ، ۱۳۷۵ھ، (دسمبر ۱۹۵۵ء وجنوری ۱۹۵۶ء) شائع کیا گیا ۱۲۵؍صفحات کا،

ابتداء کے ۱۶ صفحات میں عربی زبان میں مضامین تھے، اس میں ''افکار ومطالعات'' کے علاوہ ''ملک معظم کے تین خطبے'' اور ''مملکت سعودیہ کے مرکزی شہر'' اہمیت کے حامل تھے، ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا عربی زبان میں ایک منظّم استقبال تھا، شاہ سعود کی آمد کے دوران ''البلاغ'' اور خدام النبی کے علاوہ مختلف فرموں اور اداروں نے مجھ سے شاہ کے استقبال کے استقبالی خطبے اور اشتہارات وغیرہ لکھوائے جس سے مجھ کو ہزاروں روپئے ملے، اور اس سے میں نے مبارکپور میں سڑک والا مکان غالباً ۱۲۰۰؍سو میں خریدا، میں اس وقت بمبئی تھا وہاں سے روپیہ بھیجا تھا والد مرحوم اور بھائی حیات النبی مرحوم نے معاملہ طے کیا تھا۔

شاہ سعود کے قیام بمبئی کے وقت بعض اہل علم ان کے متعلقین کے ذریعہ روپیہ وصول کرتے تھے، مجھ سے بھی بعض بہی خواہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کو کہا مگر میری غیرت وخودداری نے اس کو بالکل پسند نہیں کیا۔

الحاج محی الدین منیری اور الحاج مختار احمد:۔ البلاغ میں آنے کے بعد جناب الحاج محی الدین منیری بھٹکلی صاحب اور عزیزی الحاج مختار احمد صاحب جاوید سے تعلق ہوا، منیری صاحب انجمن خدام النبی کے آفس انچارج اور البلاغ کے مدیر مسئول تھے اور مختار احمد کے والد حاجی محمد مشتاق ساحب امروہہ کے ایک نیک آدمی تھے، بمبئی میں رومال اور گھڑی کی تجارت کرتے تھے، انھوں نے دوسرا نکاح بھٹکل کی ایک خاتون سے کیا، مختار احمد ۱۷؍۱۸ سال کے تھے، مسافر خانہ میں عطر کی ایک دوکان پر ملازم ہوئے، میرے کمرے میں رہتے تھے، اور تعلق ہوجانے پر ایک معلم ان کو مکہ مکرمہ لواگئے وہاں بھی عطر کی دوکان پر رہے، اور حجاج کے ایک وکیل کے یہاں بھی کام کرتے تھے، تقریباً ۲۵؍سال سے مکہ مکرمہ میں ہیں، وطن بھٹکل آمد ورفت ہے، نہایت شریف الطبع، حجاج اور عوام کے خادم، اور بے لوث و بے غرض خوش دل آدمی ہیں، ان سے تعلقات کی نوعیت خاندانی ہوگئی ہے، خالد کمال اور سلمان مبشر کے جامعہ

اسلامیہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران گویا مختار صاحب ان کے چچا اور سرپرست رہے ہیں، **الجامعة الحجازیه** کے قیام میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اب تک اس کی طرف خاص توجہ رکھتے ہیں، انھوں نے مجھے مسعودی کی ''مروج الذہب'' اور شاطبیؒ کی ''الاعتصام'' ہدیہ میں دی ہے، وہ مبارکپور آچکے ہیں، میں بھٹکل جاچکا ہوں، منیری صاحب جب تک بمبئی میں رہے حجاج کی خدمت کرتے رہے اور ان کی ہر قسم کی ضرورت کا خیال رکھتے تھے، اب بھٹکل جامعہ اسلامیہ کے ناظم اور دوسری دینی تحریکات کے رکن ہیں۔

پہلا سفرِ حج (۱۳۷۴ھ):۔ رمضان ۱۳۷۳ھ (مئی ۱۹۵۴ء) میں انجمن خدام النبی کی طرف سے مجلّہ البلاغ جاری ہوا اور اس کی ادارت اور انجمن خدام النبی سے منسلک ہوا، اور ایک سال کے بعد ۱۳۷۴ھ میں حج وزیارت کی توفیق مل گئی، طالبعلمی کے زمانہ میں سوچا کرتا تھا کہ مدرسی کی تنخواہ سے بچا بچا کر بہت دنوں کے بعد یہ دولت نصیب ہوسکتی ہے، انجمن خدام النبی کے مخلص اراکین احمد بھائی وغیرہ اپنے متعلقین ومتوسلین کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور ان کو جہاں موقع ملا حج کو بھیج دیا کرتے تھے، اس زمانہ میں نہ آج کی طرح مشکلات تھیں اور نہ ہی اتنے اخراجات تھے ، احمد بھائی نے کہا کہ ہم آپ کو حج پر بھیجنا چاہتے ہیں آپ کو منظور ہو تو اجازت دیں اور تیاری کریں، میں نے بڑے تشکر کے انداز میں اپنی خوش بختی کا اظہار کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور ۱۷/اگست ۱۹۵۵ء اسلامی یا مظفری جہاز سے روانہ ہوا، زندگی میں پہلا حج تھا، جذبات واحساسات میں طوفان تھا جو بیان سے باہر ہے، اس سال مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری (شیخ اس سال شاہ عبدالقادر رائپوری کی علالت کی وجہ سے حج میں نہیں جاسکے تھے جیسا کہ ''آپ بیتی'' میں مذکور ہے، قاضی صاحب کو سہو ہوا ہے) اور مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت تبلیغ کے علاوہ اور بہت سے متعارفین تشریف لے جارہے تھے۔ اس مقدس سفر کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

مکہ مکرمہ میں احمد بھائی کے یہاں قیام وطعام تھا، ان ہی نے ہر قسم کے اخراجات برداشت کئے، جدہ میں اتر کر دوسرے دن شہر میں گیا، وہاں یاقوت حموی کی معجم الادباء بیس جلدیں صرف بیس ریال میں مل رہی تھی، سوچا کہ بعد میں خریدوں گا مگر نہیں خرید سکا، پرانی کتابوں کی ایک دکان پر طبقات الخواص عدن کے عباد وصلحاء پر دیکھا اس کو نہیں خرید سکا، مکہ مکرمہ سے امام ابن حزم ملی کی محلّیٰ اوران ہی کی طرق الحمامہ خریدی، اس کے علاوہ رحلہ ابن جبیر خریدا، مدینہ منورہ سے سمہودی کی وفاء الوفاء اور ابن نجار کی تاریخ المدینہ خریدی مگر یہ دونوں کتابیں واپسی پر بستر موٹر کے اوپر سے گر جانے کی وجہ سے دوسرے تمام سامان کے ساتھ ضائع ہوگئیں، روضہ مطہرہ کے اندر کی خاک بھی اغوات سے حاصل کی تھی وہ بھی اس میں چلی گئی جسکا بہت افسوس رہا، عرفاء وصالحین نے کہا کہ دیار پاک کی کنکری بھی نہیں اٹھانی چاہئے، اوران کوان کے مقدس مقام سے جدا کرنا ادب کے خلاف ہے، شاید اس وجہ سے یہ خاک پاک وہیں رہ گئی، مولانا عبداللہ زمزمیؒ ایک مجذوب قسم کے بزرگ تھے، انھوں نے مجھے کئی کتابیں دی تھیں جو میرے کتب خانہ میں بطور تبرک کے موجود ہیں۔ان پران کا تہدیہ اور دستخط بھی ہیں۔رجال السند والہند کا مسودہ ساتھ لیتا گیا تھا، اس پر استاذ احمد السباعی مفتش وزارت مالیہ اور تاریخ مکہ کے مؤلف نے عمدہ تقریظ لکھی تھی جو اس کے مطبوعہ بمبئی میں موجود ہے، مولانا سید علوی مالکیؒ مکہ مکرمہ کے مشہور عالم اور حمامۃ الحرم کہے جاتے تھے، ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا، سید احمد کے جھوٹے ''وصیت نامہ'' پر ان کا ایک مضمون مجلۃ الحج میں چھپا تھا اس کا ترجمہ میں نے البلاغ میں شائع کیا تھا، اس کوان کو پیش کیا بہت خوش ہوئے، اور دعا دی، اس کے بعد والے حج میں بھی ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، پہلے باب السلام کے اوپر کمرہ میں رہا کرتے تھے بعد میں جنت المعلیٰ کی طرف مکان میں رہنے لگے تھے، ان کے صاحبزدے محمد حسن علوی مالکی سے بمبئی اور مکہ مکرمہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، فرصت کے اوقات مکہ مکرمہ میں مکتبہ

الثقافۃ عبدالشکور فدا (اندرون باب السلام) میں جایا کرتا تھا کتابیں پڑھنا تھا اور اہل علم سے ملاقات ہوتی تھی اور مدینہ منورہ میں مکتبہ علمیہ (باب الرحمۃ کے سامنے) میں جاتا تھا یہاں بھی یہی شغل رہتا تھا۔

رجال السند والہند کی طباعت:۔ ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۸ء) میں میری کتاب رجال السند و الھند مطبعہ حجازیہ بمبئی میں طبع ہوئی، احمد بھائی مرحوم اور ان کے بھائیوں کی توجہ سے، ایک دن صبح کو میں مسودہ لے کر حسب سابق پڑھانے کے لئے ان کے یہاں گیا اور اس کو دکھا کر طباعت کی خواہش ظاہر کی، ان حضرات نے فوراً کہا کہ انتظام کیجئے، خود دلچسپی لی اور دمشق کے ایک عالم سے جو ان کے یہاں مہمان تھے دمشق میں چھپوانے کی بات کی، انھون نے وہان سے معلومات حاصل کر کے لکھا کہ یہاں طباعت میں زیادہ صرفہ ہوگا اور پریشانی بھی ہوگی لہٰذا بمبئی میں طباعت کرالیں، چنانچہ مطبعہ حجازیہ بمبئی سے بات چیت کی، معاملہ طے ہوگیا، فی صفحہ دس روپیہ اجرت طباعت کاغذ کے علاوہ طے ہوئی، ایک ہزار روپئے کے مزید حروف ......خریدے اور احمد بھائی نے کاغذ پریس میں پہونچادیا، کم وبیش پانچ ہزار روپیہ ان لوگوں نے خرچ کیا، بعض دوسرے اہل خیر نے تعاون کیا اور کتاب چھپ گئی اس کی اشاعت کے بعد اوساط علمیہ میں میرا خصوصی تعارف ہوگیا، کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کی وجہ سے تصنیف وتالیف میں اپنا مقام پیدا کیا، ملک اور بیرون ملک کے اہل علم، جرائد ومجلّات نے شاندار استقبال کیا۔

رسالہ معارف سے تعلق (۱۹۵۸ء):۔ ''البلاغ'' کے تبادلہ میں رسالہ ''معارف'' دارالمصنفین آتا تھا، میں زمانۂ طالب علمی سے اس کو نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا، اس کے اڈیٹر حضرت شاہ معین الدین احمد ندویؒ ناظم دارالمصنفین تھے، نہایت نیک، بزرگ اور خاندانی عالم تھے، میں ان سے ملنے کے لئے اور کتابوں کی مراجعت کیلئے بمبئی سے آتا تو اکثر دارالمصنفین جاتا تھا اور ان

سے خاص طور سے ملتا تھا وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے، ایک مرتبہ ''رجال السند والہند'' کا مسودہ ان کو دکھایا تھا اور انھوں نے تشجیع فرمائی تھی ''البلاغ'' میں میرے تاریخی اور تحقیقی مضامین پڑھتے تھے، کہتے تھے کہ ''البلاغ'' آتا ہے تو میں آپ کے مضامین خاص طور سے پڑھتا ہوں اور یہ کہ یہ مضامین ''البلاغ'' کے قارئین سے بالاتر ہیں، آپ ان کو ''معارف'' میں دیجئے، میں عرض کرتا کہ میرے مضامین اس لائق نہیں ہوتے ہیں، کہتے تھے کہ میں کور کسر درست کر دوں گا، بہر حال ان کی مشفقانہ فرمائش بلکہ اصرار پر میں نے رجال السند والہند کے مسودہ کا خلاصۃ الخلاصہ ''ساتویں صدی تک کے رجال السند والہند'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ ''معارف'' کیلئے تیار کیا، جس کو شاہ صاحب نے جنوری تا مارچ ۱۹۵۸ء کے معارف میں تین قسطوں میں شائع کیا اور پہلی قسط کو سر مقالہ بنایا، اس کے بعد ''معارف'' میں میرے مضامین ومقالات کا سلسلہ شروع ہو گیا، حضرت شاہ صاحب اکثر مقالات کو سر مقالہ بنایا کرتے تھے، ''معارف'' کی بزم میں مجھ کو لانے والے حضرت شاہ صاحب ہیں، اب میں بمبئی سے آتا تو بار باران کی خدمت میں حاضر ہوتا اور کھل کر باتیں کرتا تھا، دیر تک بٹھاتے تھے، اٹھنے نہیں دیتے، فرمایا کرتے تھے کہ مجھ کو آپ سے محبت ہے، ایک مرتبہ ردولی سے تشریف لائے تھے، میں گیا تو مجھ کو اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گئے کہ گھر سے مٹھائی لایا ہوں اور دفتر سے کمرہ تک میرے کندھے پر اپنا دست شفقت رکھے رہے، دو بار حج میں ان کا ساتھ رہا، وہاں بھی خوب گذرتی تھی اور بہت خیال فرماتے تھے دوسرے حج میں مولانا عبدالسلام قدوائی بھی ان کے ساتھ تھے، وہ کہنے لگے کہ اب آپ کو دیکھ کر بڑھاپے کا احساس ہونے لگا ہے، بمبئی چھوڑیئے اور دار المصنفین آیئے، میں نے کہا کہ حضرت شاہ صاحب کی نظامت میں رہ سکتا ہوں، فلاں صاحب کی ماتحتی میں نہیں رہ سکتا ہوں، شاہ صاحب نے کہا کہ ناظم تو میں ہی ہوں وہ میرے ماتحت رہ کر کام کرتے ہیں، میں نے کہا کہ ایک مرتبہ عالم اسلام کا سفر

کرنے کے بعد سوچوں گا ، شاہ صاحب کہا کرتے تھے کہ آپ اپنی کتابیں دار المصنفین کو دیا کریں، آپ کو مالی فائدہ بھی ہوگا، اور میں عرض کرتا کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے میری کتابیں ابتداء میں شائع کر کے اوساط علمیہ میں میرا تعارف کرایا ہے، اب یہ بات مروّت واخلاق کے خلاف معلوم ہوتی ہے اوراس سے ان کو قلبی تکلیف ہوگی ،شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ''معارف'' میں میرے مضامین شائع کرنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا تھا پھر بعد میں گاہے گاہے چھپنے لگے۔

انجمن اسلام ہائی اسکول میں (نومبر ۱۹۶۰ء):۔انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے مشہور اسکولوں میں ہے، جو مسلمانوں کے تعاون وتوجہ سے چلتے ہیں، اس میں ایک بوڑھے مولوی صاحب دینیات واخلاقیات کا درس دیتے تھے، ان کے انتقال کے بعد اس جگہ کیلئے پرنسپل ضیاء الدین خلیفہ نے احمد بھائی سے میرے بارے میں کہا، احمد بھائی نے میری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے عذر کیا، مگر ان کا اصرار رہا کہ قاضی اطہر مبارکپوری مشہور عالم ہیں ان کی وجہ سے ہمارے اسکول کو فائدہ ہوگا ، احمد بھائی نے مجھ سے کہا کہ آپ منظور کرلیں ، بچوں کو دینی فائدہ ہوگا اور آپ کو بھی مالی فائدہ ہوگا ، اس وقت مجھ کو انقلاب سے ۱۵۰/روپیہ اور ''البلاغ'' یا احمد بھائی وغیرہ کو پڑھانے پر ۱۰۰/روپیہ ملتا تھا، میں لکھنے پڑھنے میں بے حد مصروف تھا، مگر قبول کرلیا مشاہرہ غالباً ۳۵۰/روپیہ تھا، اور دس سال تک وہاں دینیات واخلاقیات کی تعلیم دی، یہ زمانہ بمبئی میں میری آمدنی کے اعتبار سے بہترین زمانہ تھا، ابتداء میں پورا وقت اسکول میں دیتا تھا بعد میں پرنسپل نے میری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے تمام اسباق پہلے وقت میں کرادئے اور میں ایک وقت جانے لگا تھا، ابتداء میں ٹیچروں اور بچوں کو سلام کرتا تھا تو مذاق اڑاتے تھے، مگر بعد میں پورے اسکول میں سلام کا یوں رواج ہوگیا کہ بعض اساتذہ کے بقول مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا سماں پیدا ہوگیا حتیٰ کہ ہندو اور عیسائی ٹیچر بھی سلام کرنے لگے، بچے بے حد مانوس ہوگئے ، اور میرے ادب واحترام کا پورا پورا

خیال رکھنے لگے، اسی سے متعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ تھا، مرحوم عبدالرزاق قریشی (بسہم، اعظم گڈھ) اس کے رکن اور دو ماہی رسالہ........... کے مدیر تھے، وہ مجھ سے عربی پڑھنے لگے اور شدبد کی حد تک پڑھ لیا نہایت نیک، صالح اور مخلص آدمی تھے، نجیب اشرف ندوی ڈائرکٹر تھے، حامد اللہ ندوی بھی تھے، ان سب سے تعلقات تھے،

انجمن اسلام کے میرے شاگرد اب تک بڑے بڑے عہدوں اور باحیثیت ہونے کے باوجود مل جاتے تھے تو احترام میں بچھے جاتے ہیں، یہ بات عربی مدرسوں کے طلبہ میں نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف معاملہ ہے۔

ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی:۔ڈاکٹر شیخ عبد المنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقباوی دونوں حضرات جامعہ ازہر قاہرہ سے دارالعلوم دیوبند میں مبعوث ہوکر جنوری ۱۹۵۶ء میں آئے، اور ۲۷/ ماہ یہاں قیام کر کے ۱۹۵۸ء میں واپس ہوئے، ڈاکٹر شیخ عبدالمنعم النمر سے میری پہلی ملاقات سورت میں جمعیۃ علماء کے سالانہ اجلاس میں ہوئی، وہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ جمع کررہے تھے، اس سلسلہ میں باتیں ہوتی رہیں، اسی زمانہ میں انھوں نے ''مجلة الحج'' مکہ مکرمہ میں ''المسلمون فی الھند'' کے عنوان سے مضامین شائع کئے، جس میں ''تھانہ'' کے ذکر میں میرا حوالہ دے کر بعض باتیں درج کیں، اور جب وہ دونوں حضرات واپس ہونے کیلئے بمبئی آئے اور ہفتوں بحری جہاز کے انتظار میں مسافر خانہ میں رہے تو ہر وقت ملاقات ہوتی تھی، اس وقت میری کتاب ''رجال السند والہند'' چھپ رہی تھی، اور اس کے مطبوعہ فرمے ڈاکٹر النمر ساتھ لے گئے اور کتاب پر اپنی رائے لکھی جو مطبوعہ بمبئی میں موجود ہے، آدمی متنور، ملنسار، علم و تحقیق کے ذوق کے تھے، اس لئے تعلقات بے تکلفانہ اور عمیق ہوگئے، اور میرے کمرے میں آنے جانے لگے، پہلی بار آئے اور چٹائی پر کتابوں اور اخبارات کو بکھرا ہوا دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے ''یا سلام تأھلت بالکتب والکتابة'' یہ جامع جملہ میرا بہترین اور جامع تعارف

ہے، قاہرہ جاکر تاریخ الاسلام فی الھند شائع کی تو ایک نسخہ مجھے ۲۲/اپریل ۱۹۶۱ء کو بھیجا اور لمبا چوڑا خط بھی لکھا، اور ''رجال السند والہند'' کا تقاضا کیا جس کو میں نے بھیجا، اس زمانہ میں ہندوستانی سفارت خانہ قاہرہ نے ''صوت الھند'' کے نام سے عربی میں ایک کتابچہ پروپیگنڈہ کیلئے شائع کیا جس میں نمر صاحب نے ہندوستان کے بارے میں طویل مضمون لکھا اور اس میں انجمن خدام النبی رسالہ البلاغ اور میرا ذکر کیا، بعد میں ''مجلّہ الوعی الاسلامی'' کویت کے اڈیٹر ہوکر آئے اس زمانہ میں کویت کے ایک صاحب کو جو بمبئی آرہے تھے، میرا پتہ دے کر ملاقات کرنے کی تاکید کی تھی وہ کوئی علمی آدمی رہے ہوں گے، مغرب کے بعد میں کمرے میں لکھ پڑھ رہا تھا وہ صاحب کوٹ پتلون میں ملبوس تھے دروازہ کھولا، سلام کے بعد بیٹھنے کو کہا تو انھوں نے کہا کہ کہاں بیٹھوں؟ میں نے کرسی کھول دی مگر وہ کھڑے رہے اور کہنے لگے کہ میں تاج محل (ہوٹل) کے فلاں کمرے میں مقیم ہوں، وہاں ملئے، میں نے اچھا تو کہا مگر ملنے کیلئے نہیں گیا، وہ بیچارے نمر صاحب کی ہدایت پر آئے، اپنے موجودہ عربی ذوق کے مطابق ذہن میں بلند خیالات رہے ہوں گے مگر یہاں گرا پڑا کمرہ ٹوٹی گندی چٹائی اور کتابوں کے ڈھیر دیکھ کر ان کو وحشت ہوئی ہوگی، شیخ عبدالمنعم النمر نے مولانا ابوالکلام آزاد پرڈاکٹریٹ کی تھی، اور ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی جدوجہد پر عربی میں کتاب لکھی تھی، عرب افریقہ کے سفر میں قاہرہ آتے جاتے ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، ایک مرتبہ ان کے مکان پر بھی گیا تھا، اس وقت وہ جامعہ ازہر کی بعثات کے مدیر تھے اور مبعوثین ومدرسین کا مجمع ان کے آفس میں لگا رہتا تھا، اس کے بعد بمبئی آئے تو ملاقات ہوئی اور آخر میں گزشتہ سال مولانا آزاد صدی پر حکومت ہند کی دعوت پر دہلی آئے تو دارالعلوم دیوبند سے ان کی ملاقات کیلئے ہوٹل میں گیا اور ''العقد الثمین'' ان کی طلب پر پیش کی، انھوں نے ''الحکومات العربیہ فی الھند'' پر شاندار مقدمہ لکھا۔ افسوس کہ ذوقعدہ ۱۴۱۱ھ میں قاہرہ میں انتقال کرگئے،

ہاں دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ پر تشریف لائے تھے، اس وقت وزیر اوقاف تھے، اس وقت بھی برابر ملنا ہوتا تھا،

علی و حسین (۱۹۶۰): ۔ ۱۹۵۹ء کے حدود میں پاکستان (کراچی) سے محمود احمد عباسی امروہوی کی فتنہ انگیز کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' شائع ہوئی اور ہندو پاک کے بعض طبقوں نے اس کو خوب خوب اچھالا اور چھاپ کر شائع کیا، اس کے متعدد جوابات اخبارات ورسائل اور کتابوں میں دئے گئے، میں نے بھی اخبار انقلاب میں ۴/ جمادی الاولیٰ لغایت ۱۶/ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ۷/ نومبر تا ۱۷/ دسمبر ۱۹۵۹ء ۳۵/ قسطوں میں اس کا جواب لکھا، جن کو مرتب کر کے ''علی و حسین'' کے نام سے مارچ ۱۹۶۰ء میں شائع کیا جو کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کے جواب میں تمام مضامین و کتب میں سب سے بہتر مدلل اور صحیح مانی گئی اخبارات ورسائل اور اہل علم نے اس کو واقعی جواب قرار دیا، ''خلافت معاویہ ویزید'' کے پُرزور مبلغ وناشر مولانا عامر عثمانی ''مدیر تجلی'' تھے اور جماعت اسلامی کے عام لوگ اس کو نئی تحقیق قرار دیتے تھے، ان کے علاوہ بھی نیم خواندہ طبقہ اس کا پروپیگنڈا کرتا تھا، ہندو پاکستان میں ہنگامہ برپا تھا۔

دیوان احمد (۱۹۵۸): ۔ نانا مولانا احمد حسین صاحبؒ عربی کے بلند پایہ شاعر تھے، ان کے اشعار کاغذات میں بکھرے ہوئے تھے، ''رجال السند والهند'' کی طباعت کے دوران انکو مرتب کر کے شائع کرنے کی تاکہ کسی حد تک یہ ادبی جواہر پارے محفوظ ہو جائیں، اور جیسے تیسے اس کا انتظام کر کے رمضان ۱۳۷۷ھ، اپریل ۱۹۵۸ء میں طبع کرایا، مولانا احمد حسین صاحب، مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی اور مولانا ظفر الدین صاحب بہاری تینوں اہل علم نے مولانا شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی سے مدرسہ عالیہ رامپور میں عربی ادب کی تعلیم حاصل کی، مولانا احمد حسین صاحب صاحب دیوان شاعر ہوئے، مولانا ظفر الدین صاحب بہاری نے بعد میں مولانا احمد رضا خان بریلوی سے تلمذ حاصل کیا اور حدیث میں ''صحیح البهاری''

لکھی، اور مولانا عبد العزیز میمنی راجکوٹی عربی زبان وادب کے عالمی ادیب وعالم تسلیم کئے گئے، ''کتاب الامالی'' ابوعلی قالی کی شرح لکھی...... کے زائد اشعار جمع کئے، ابو العلاء معرّی پر کتاب لکھی، الغرض عالمی شہرت کے مالک تھے، ان تینوں حضرات کے شیخ محمد طیب صاحب عرب کے شرف تلمذ کے بارے میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی (کلکتہ) نے راقم کو براہ راست معلومات دی ہے اور اپنے ایک طویل عربی کے قصیدہ میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

مولانا عبد العزیز میمنی راجکوٹی (۱۳۷۹ھ):۔ ۱۳۷۹ھ میں دنیائے ادب وعربیت کے مشہور عالم ادیب مولانا عبد العزیز میمنی راجکوٹی سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ صابوصدیق انسٹی ٹیوٹ شیفر روڈ میں ''عربی اور فارسی'' کے موضوع پر ان کا لکچر ہے، دفتر انقلاب سے قریب ہی یہ اسکول ہے، شام کو چار بجے میں اپنے کام سے فارغ ہوکر سادہ لباس میں لکچر سننے کیلئے گیا، پورا ہال جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے پُر تھا، پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی نے مجھے ایک میز پر بٹھایا اور خود بھی اسی پر بیٹھے، لکچر ختم ہونے پر لوگ میمنی صاحب سے ملاقات ٹوٹ پڑے، آخر میں دسنوی صاحب نے میرا تعارف کرایا، فوراً انھوں نے کہا کہ میں آپ کی کتاب ''رجال السند والہند'' پڑھی ہے، (جو نئی نئی شائع ہوئی تھی) اور کہا کہ معارف میں آپ کا مقالہ ''دولت سامانیہ سنجان'' بھی پڑھا ہے، (یہ مقالہ معارف میں مارچ تا مئی ۱۹۵۹ء تین قسطوں میں شائع ہوا تھا) ''رجال السند والہند'' کے بعض اشعار کے بارے میں آپ کو بتاؤں گا، یہ کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور سب سے یکسو ہوکر بات کرتے ہوئے موٹر پر بٹھایا اور اپنے ساتھ مینارہ مسجد کے عقب میں آفندی صاحب کے یہاں لیوا گئے جہاں وہ مقیم تھے، (آفندی صاحب راشننگ آفیسر تھے) وہ پاکستان سے آئے تھے، کئی دن تک صبح وشام ان کے یہاں آتا جاتا رہا، بڑی محبت اور خورد نوازی سے ملتے تھے، ان میں اہل علم کی شان تھی، تعلّی بھی بہت تھی، کہتے تھے کہ مجھے عربی کے دولاکھ اشعار یاد

ہیں ، اپنے حریف مولانا ابو عبد اللہ سورتی کا نام لیتے تو اخی رضی اللہ عنہ کہتے تھے ، ہماری طالب علمی کے زمانہ میں جب ان کی شرح ''امالی'' ابوعلی قالی مصر سے شائع ہوئی تھی تو مولانا ابوعبد اللہ سورتی نے اس پر ''معارف'' میں سخت تنقید کی اور مولانا راجکوٹی نے ''برہان'' میں اس کا جواب لکھا، دونوں ادیبوں کی نوک جھونک کا فیصلہ مولانا اعزاز علی صاحب نے کیا اور معاملہ ختم ہوا باتوں بات میں مولانا نے بتایا کہ ''مقامات حریری'' کا سب سے صحیح نسخہ وہ ہے جو ۱۲۶۳ھ میں لکھنؤ میں فارسی ترجمہ کے ساتھ چھپا ہے، یہ نسخہ میرے پاس موجود ہے، ان کا ارادہ کراچی میں ایک شاندار کتب خانہ قائم کرنے کا تھا، اسی زمانہ میں احمد بھائی مرحوم نے ناسک کے مشہور عالم عبد الفتاح گلشن آبادی کا پورا کتب خانہ خرید لیا تھا جس میں بہت سے مخطوطات تھے، مولانا میمنی بہت سے مخطوطات لے گئے جن میں فتاویٰ مولانا ہاشم تتوی کی جلدیں بھی تھیں ، میں نے بھی اس کتب خانہ سے کئی کتابیں حاصل کیں ، کئی دنوں تک مولانا میمنی کی مجالس سے علمی وادبی اور تاریخی فائدے حاصل ہوئے اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا، میں نے اپنے بعض مضامین میں ان کے استفادات سے کام لیا ہے، اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ میرے نانا کے ساتھ مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا شیخ محمد طیب صاحب عرب مکی سے پڑھتے تھے، یہ بات چند سال پہلے معصومی صاحب سے معلوم ہوئی ہے۔

الحاج سیٹھ ابراہیم موتی والا صاحب میمن ، دھوراجی کے اہل علم ہیں اور اہل علم کے قدر داں ہیں ، ان کا بیان ہے کہ کراچی میں مولانا عبد العزیز راجکوٹی نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ہندوستان میں عربی کے دو عالم و مصنف قابل ذکر ہیں ، ایک مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ، اس وقت سے میں نے قاضی صاحب سے علمی ربط پیدا کرنا شروع کر دیا ، (وہ مجھے اپنے وطن دھوراجی لے گئے تھے)

نارجیل سے نخیل تک (۱۹۶۲ء):۔ ''نارجیل سے نخیل تک'' کے عنوان

سے عرب و ہند کے تعلقات پر میرا ایک طویل مقالہ ''معارف'' میں مئی تا اگست ۱۹۶۲ء میں چار قسطوں میں شائع ہوا، اس کی اہمیت وافادیت حکومت ہند نے بھی محسوس کی اور اس کے بعد اس کا عربی ترجمہ کر کے سرکاری سہ ماہی عربی مجلّہ ''ثقافة الهند'' میں شائع کرا کر بہت سے پرچے عرب ممالک کے سفارت خانوں میں بھیجا اور ہندوستان کے عرب ممالک میں ہندی سفارت خانوں کو بھیجا اور تقسیم کرایا، اس کی اہمیت کے پیش نظر سعودی عرب کے مشہور ادیب و محقق اور مصنف وصحافی استاذ عبد القدوس انصاری نے اپنے مجلّہ شہریہ ''المنهل'' جدہ میں دو یا تین قسطوں میں اہتمام سے شائع کیا اور اس پر کچھ تعلیقات بھی کیں، ''ثقافة الهند'' اور ''المنهل'' کے یہ سب پرچے میرے پاس محفوظ ہیں،

نوساری (گجرات) کے گجراتی پرچہ ''قلم'' میں اس کا گجراتی ترجمہ شائع ہوا، احمد آباد سے ایک غیر مسلم اسکالر نے اس کے بارے میں مجھ سے خط و کتابت کی۔

<u>جدہ میں سعودی سفارت خانہ میں دعوت (۱۳۸۵ھ)</u>:۔ میں جب ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵) میں دوسری بار حج وزیارت کیلئے گیا تو ہندوستانی سفارت خانہ جدہ نے میری شاندار دعوت کی اور سعودی عرب کے صحافیوں کو مدعو کیا، اس وقت جناب سید شہاب الدین ممبر پارلیمنٹ ہندوستانی سفارت خانہ میں غالباً فرسٹ سکریٹری تھے، بڑے چاق و چوبند اور فعال آدمی ہیں، اخبارات میں اس دعوت کا اعلان کیا اور رات کو سفارت خانہ کی طرف سے اس کے آفس میں دعوت کی، جس میں سعودی عرب کے ادباء و مصنفین اور صحافی مدعو تھے، ان ہی میں استاذ عبد القدوس انصاری بھی تھے، جنھوں نے اپنے مجلّہ میں میرا مقالہ شائع کر کے اس پر تعلیق کی تھی، اس تقریب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی جو بعد میں مستحکم علمی تعلقات کا باعث بن گئی، میری دو کتابوں پر انھوں نے مقدمہ لکھا، ۷/رجب ۱۴۰۳ھ کو فوت ہوئے، رحمہٗ اللہ

استقبالیہ میں کھانے کا انتظام مغربی طرز پر کھڑے کھڑے تھا، میں نے جرأت

کر کے کہا کہ میں اسلام کے وطن میں نصاریٰ کے طریقہ پر نہیں چلوں گا، یہ کہہ کر اپنے حصہ کا کھانا لے کر دوسری طرف میز کرسی پر بیٹھ گیا، یہ دیکھ کر سب حضرات نے ''واللہ صحیح واللہ صحیح'' کہتے ہوئے میز کرسی پر کھانا کھایا۔

اس زمانہ میں میرے کئی مضامین متعلقہ ہند وعرب مطبوعہ ''معارف'' کا عربی میں ترجمہ ''ثقافة الهند'' میں چھپا، ترجمہ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی کے بھائی مولانا عمید الزماں کیرانوی کرتے تھے، ایک بار انھوں نے اس سلسلہ میں بعض باتیں بھی معلوم کی تھیں، ''ثقافة الهند'' کے مضامین پر معاوضہ ملتا ہے اسی دوران اس کے شریک ادارہ مصر کے صحافی زغبی قاہرہ جاتے ہوئے بمبئی آئے اور میری ان سے ملاقات ہوئی، میرے مضامین کا تذکرہ آیا تو انھوں نے پوچھا کہ معاوضہ ملتا ہے یا نہیں ؟ میں نے انکار کیا تو کہا کہ ادارہ کے لوگ اس رقم کو لے کر ہضم کر جاتے ہیں، آپ ان پر مقدمہ کریں، میں نے ان کو لکھا تو جواب دیا کہ ہم نے دارالمصنفین سے اجازت لی ہے، اور مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی کو میں نے لکھا تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھ سے کسی نے اجازت نہیں لی ہے، بات آئی گئی ہوئی، سالوں تک ''ثقافة الهند'' میرے نام آتا رہا،

مزید انہماک :۔ میں ''انقلاب'' اور ''البلاغ'' کے علاوہ ''معارف'' ''صدق جدید'' اور ''برہان'' وغیرہ میں مضامین لکھنے کے ساتھ عربی اردو میں تصنیف و تالیف میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتا تھا، اسی میں بہت محدود طور پر شہر کی علمی و اصلاحی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا، الغرض اپنے کو بالکل مصروف کر رکھا تھا، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ایک مرتبہ بمبئی میں کہا کہ آپ کے انہماک و مصروفیت کو دیکھ کر الفرقان کے لئے مضمون کا تقاضہ کرنے میں ڈر معلوم ہوتا ہے، اس دوران انجمن اسلام ہائی اسکول کی ملازمت کرنی پڑی، ابتداء میں پورا وقت دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میرے لکھنے پڑھنے میں حرج ہو رہا تھا اور سخت پریشانی تھی کہ میں عربی مدرسہ کا

آدمی ہوں، اگر مدرسی کرنی ہوتو کسی مدرسہ میں جانا چاہئے تھا، اسکول وغیرہ کی ملازمت میرے ذوق کے بالکل خلاف تھی، اسکول کے طلبہ کو دینی باتیں سکھانا، دینی قصے سنانا اور دین کی موٹی موٹی باتیں بتانا میرے نزدیک بے جوڑ بات تھی، میں نے دولت کے شہر میں دولت کی طرف نہیں دیکھا، اسکول میں آ کر میرا علم ختم ہو رہا ہے، روپیہ مقصود ہوتا تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کی پیش کش کو قبول کر لیتا، اس احساس کے بعد میں نے لکھنے پڑھنے میں مزید انہماک پیدا کرلیا، انجمن اسلام ہائی اسکول میں کریمی لائبریری کے نام سے قدیم اردو عربی فارسی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، اس کو میں نے غنیمت سمجھا اور اس سے کتابیں لا کر استفادہ کرنے لگا، قدیم اردو اخبارات سے مبارکپور اور اعظم گڈھ کے بارے میں معلومات جمع کرنے لگا، گذشتہ صدی میں یہاں کے فسادات وغیرہ کے بارے میں کافی مواد جمع کیا۔

عرب و ہند عہد رسالت میں (۱۹۶۴) انجمن اسلام ہائی اسکول کی ملازمت اور اپنی مصروفیات میں میں نے علمی کام کی توجہ زیادہ کردی اسی وقت خیال ہوا کہ عہد رسالت اور ہندوستان کے نئے موضوع پر لکھنا چاہئے، میرے پاس رجال السند والہند کے مسودات تواریخ وجغرافیہ کے اقتباسات ضخیم مقدار میں محفوظ تھے، ان سے کافی مدد ملی، نیز اس موضوع کے متعلق معلومات کرنا شروع کیا اور پہلی قسط ''نارجیل سے نخیل تک'' چار نمبروں میں ۱۹۶۲ء کے معارف میں شائع کیا جو بیحد مقبول ہوا جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس کے بعد اس سلسلہ کے مضامین لکھتا رہا جو شائع ہوتے رہے، بعد میں آخری ابواب وصفحات کا اضافہ کرکے عرب و ہند عہد رسالت میں مرتب کرلی، سوال اسکی طباعت واشاعت کا تھا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مختلف تقریبات میں بمبئی آتے جاتے تھے، وہ پہلے ہی میرے حال پر مہربان تھے، میں نے ان سے گذارش کی کہ آپ اس کو ندوۃ المصنفین سے شائع فرمائیں۔ مفتی صاحب نے نہایت انشراح سے اس کو قبول فرمایا اور فرمایا کہ ایسی عمدہ تاریخی کتاب ندوۃ المصنفین

سے ضرور شائع ہوگی چنانچہ میں نے ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ (اگست ۱۹۶۴ء) کو مسودہ ان کے حوالہ کیا اور کتاب رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ (جنوری ۱۹۶۵ء) میں تقریباً پانچ مہینہ کے اندر چھپ کر شائع ہوگئی، اور خدا کے فضل وکرم سے اوساط علمیہ میں امید سے زیادہ مقبول ہوئی، ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت عضو مجمع البحوث الاسلامیۃ قاہرہ نے العرب والہند في عہد الرسالۃ کے نام سے اس کا ترجمہ کرکے الہیئۃ المصریۃ العامۃ لکتاب قاہرہ سے شائع کیا، مکتبہ عارفین کراچی نے اس کا عکسی فوٹو شائع کیا، تنظیم فکر ونظر سکھر سندھ نے بھی اس کا فوٹو شائع کیا اور سندھی زبان میں اس کا ترجمہ ''عرب ءِ ہند نبی ؐ جن جی زمانیِ ھر'' کے نام سے شائع کیا، یعنی یہ کتاب ابتک تین بار چھپ چکی ہے اور عربی اور سندھی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

پروفیسر میر محمود حسین ایم اے، لیکچرر فارسی عربی، شعبۂ تحقیق اردو، جامعہ میسور نے ۱۴/ جون ۱۹۶۸ء کو اس کتاب کے انگریزی زبان میں ترجمہ کی خواہش کی اور اجازت طلب کی۔ معلوم نہیں انھوں نے یہ کام کیا یا نہیں؟

ڈاکٹر عبدالعزیز عزت مصری:۔ اس دوران بمبئی میں استاذ ڈاکٹر عبد العزیز عبدالجلیل عزت مصری جامع ازہر کے ایک فاضل مصری جوان حکومت مصر کی طرف سے بمبئی میں عربی تعلیم کیلئے مبعوث ہوکر آئے، ان کو میرے بارے میں قاہرہ ہی میں معلومات تھیں، اور مصری قرّاء جو رمضان میں بمبئی آتے تھے ان سے میرے حالات معلوم ہوئے تھے، انھوں نے قاہرہ میں اچھی خاصی اردو زبان حاصل کرلی تھی ،جس طرح ہم لوگ عربی زبان پڑھ کر سب کچھ سمجھ لیتے ہیں مگر بولنے میں وہ بات نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح وہ اردو کی کتابیں اخبارات ورسائل سب اچھی طرح پڑھتے اور سمجھتے تھے مگر بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مدرسہ کا مولوی عربی بول رہا ہے، انھوں نے مجھ سے ملاقات کی اور اسی وقت سے ہم دونوں میں علمی تعلقات ہوگئے، بعد میں وہ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی میں چلے گئے اب اور زیادہ تعلقات ہوگئے، وہ

تقریباً تین سال یہاں رہے اور ۱۹۶۵ء میں قاہرہ واپس جانے لگے تو میں نے اپنی تازہ تصنیف ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' ان کو دے کر عربی میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور انھوں نے بخوشی اس کو منظور کرلیا اور کچھ ہی مدت کے بعد عربی ترجمہ شائع ہوگیا، ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا کہ مجمع البحوث الاسلامیہ میں کئی سو کتابیں قابل اشاعت تھیں، مگر ان میں سے صرف چھ کتاب کو فی الحال منتخب کیا گیا جس میں یہ کتاب بھی تھی، کیونکہ یہ اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب تھی اور اس میں ندرت بھی تھی۔

بعد میں ڈاکٹر عبدالعزیز نے کراچی میں رہ کر وہاں کی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ان کے میرے لڑکوں خالد کمال، سلمان مبشر اور مرحوم بھائی حیات النبی وغیرہ سے ذاتی اور نجی تعلقات ہوگئے تھے، عرب وافریقہ کے سفر میں قاہرہ میں آتے جاتے ان سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، انھوں نے میری کتاب ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا بھی عربی میں ترجمہ کرکے ریاض سے شائع کیا ہے، نیز علامہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کا ترجمہ ''**الملاحة عند العرب**'' کے عنوان سے کیا ہے، بہت خلیق، شریف النفس اور علمی آدمی ہیں، میری کتاب ''تدوین وسیر ومغازی'' پر جامع ازہر کے مجلّہ ''**الازھر**'' میں بہترین تبصرہ کیا ہے، گاہے گاہے خط وکتابت رہتی ہے۔

شیخ صلاح ابو اسمٰعیل اور مصری قرّاء:۔ حکومت مصر کی جانب سے رمضان میں بمبئی میں مصری **قرّاء و مجوّدین** بھیجے جاتے تھے جو جمعیۃ علماء کے زیر اہتمام بمبئی وغیرہ کی مختلف مساجد میں تراویح کے بعد قرأت کا مظاہرہ کرتے تھے اور خطبہ بھی دیتے تھے، اور میں ان کا ترجمہ کیا کرتا تھا، پورے شہر اور اطراف میں ان کے ساتھ رہتا تھا، ان کی قیام گاہوں (ہوٹلوں) میں جاتا تھا، ان میں ایک جوان ازہری عالم وفاضل شیخ ابو اسمٰعیل تھے، جو زبردست عالم دین، نہایت پابند شرع اور نیک

وصالح انسان تھے، ان سے میرے تعلقات خاص طور سے ہوگئے، وہ کئی سال تک آتے جاتے رہے اور میں ان کے ساتھ رہتا تھا، ایک مرتبہ آزاد میدان میں انھوں نے عید کا خطبہ دیا اور میں نے ترجمہ کیا، بعد میں ان سے خط وکتابت نہیں رہی، اور جب عرب وافریقہ کے سفر کے سلسلہ میں پہلی منزل ریاض میں پہونچا تو ایک مصری اخبار میں ان کی تصویر اور ان کا نہایت شاندار دینی مقالہ دیکھا اور یہ اس وقت مصری پارلیمنٹ کے ممبر ہیں، خیال ہوا کہ قاہرہ میں ان سے ملاقات ہوگی وہاں پہونچ کر ان کا پتہ معلوم کیا، مغرب کے بعد ان کے یہاں پہونچے، خالد کمال ساتھ تھے، اس وقت ان کے یہاں کئی مصری علماء وفضلاء اور اعیان جمع تھے، ایک پکے عالم دین دوسرے پارلیمنٹ کے ممبر، صورت دیکھتے ہی مصریوں کے خاص انداز میں استقبال کیا اور بار بار کہتے رہے: أین أراک، أین أراک أین بمبئی وأین القاهره'' پھر اپنے احباب سے تعارف کرایا اور خاطر تواضع کی، ان لوگوں میں ہندوستان وپاکستان کا تذکرہ آیا تو کہا کہ ہم لوگوں کا قول ہے: الاسلام فی الهند والمسلمون فی باکستان ''یعنی اسلام تو ہندوستان میں ہے اور مسلمان پاکستان میں ہیں، اس کے بعد سخت اصرار کر کے دوسرے دن رات میں نہویت پُر تکلف دعوت طعام سے نوازا، اور اسلامی اخلاق کے ساتھ مصری اخلاق کا مظاہرہ کرتے رہے، وہ خالص دینی عالم تھے، کہتے تھے کہ میں اپنے حلقہ انتخاب میں ہفتہ میں دو دن وعظ کیلئے جاتا ہوں، آج وہاں جانے کی باری ہے، پارلیمنٹ میں میلاد النبی کے بارے میں نہایت تندوتیز تقریر کی تھی، اس کا تذکرہ بار بار کرتے تھے اور حکومت پر تنقید کرتے تھے، وہ اخوانی تو نہیں تھے مگر ان کے ذہن ومزاج کے عالم تھے، مصری پارلیمنٹ میں ان کے علم وفضل اور تقویٰ کی وجہ سے بڑی دھاک بیٹھی تھی۔

<u>ادارہ احیاء المعارف، مالیگاؤں (۱۹۶۰ء)</u>:۔ ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰ء) کے حدود میں مالیگاؤں میں ''ادارہ احیاء المعارف'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا،

اس سے پہلے مولانا عبدالحمید نعمانیؒ نے معہد ملت کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، وہ بمبئی میں اکثر آتے تھے اور میرے کمرے میں ''عثمان تاریخ کی روشنی'' نامی کتاب کی کتابت کرار ہے تھے، جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی ایک کتاب تھی، اس میں انحراف بھی تھا، اسی زمانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ بمبئی زیادہ آتے جاتے تھے، معہد ملت کے افتتاح کیلئے میرے دوست استاذ اسمٰعیل مدحت استاذ المدرسۃ الکویتیۃ بمبئی میری سفارش پر میرے ساتھ گئے، مولانا نعمانی چاہتے تھے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی معہد ملت میں کچھ وقت دیں اور ایک اسکیم بنائی کہ ایک ادارہ مالیگاؤں میں قائم کرکے عربی کی نادر و نایاب کتب اور مخطوطات کی اشاعت کی جائے، تاکہ مولانا اعظمی وہاں آئیں جائیں، وہ مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ مولانا اعظمی کو تیار کرو، مولانا اعظمی سے بھی کہتے تھے، جب ان کا اصرار زیادہ ہوا تو مولانا اعظمی نے مجھ سے کہا کہ مالیگاؤں چلو ادارہ قائم کیا جائے، چنانچہ ہم لوگ مالیگاؤں گئے، اس وقت معہد ملت کے اولیں مدرسین مولانا بشیر احمد صاحب مبارکپوری، مولانا محمد عثمان صاحب مبارکپوری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی تھے، نیز مقامی اہل علم میں مولانا محمد عثمان، مولانا عبدالقادر، مولانا نعمانی، حاجی یحییٰ زبیر وغیرہ تھے، سب نے اس کیلئے کوشش کی، مالیات فراہم کئے اور عہدہ دار منتخب ہوئے، میں اس سلسلہ میں ایک ہفتہ تک مالیگاؤں میں ٹھہرا رہا اور ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں اس ادارہ سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی تعلیق وتصحیح کے ساتھ پہلی کتاب ''إنتقاء'' (اختصار کتاب الترغیب والترہیب للمنذری، لابن حجر، م، ۸۵۲ھ) عربی ٹائپ میں شائع کی گئی، اس درمیان مولانا نعمانی وغیرہ نے یہ اسکیم بنائی کہ باہر کے مدرسین کے بجائے مقامی مدرسین رکھے جائیں، اور مبارکپور وغیرہ کے مدرسین الگ کردئے گئے، یہ تجویز علاقائی عصبیت کے ماتحت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری جگہ کے لوگ ہمارے یہاں آکر پڑھتے پڑھاتے ہیں، ہم کو چاہئے کہ اپنے لوگوں کو رکھیں، اور مقامی فارغین

وعلماء ہی کام سنبھالیں، اس کا اثر دور نزدیک پڑنے لگا اور میں اس کا مخالف ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ادارہ سے پہلی کتاب نکلی تو اس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، مولانا عبدالحمید نعمانی اور مولانا محمد عثمان صاحب مالیگانوی ہی ادارہ کے سب کچھ تھے، اور ان ہی کی جدوجہد سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا، بہر حال اس کے بعد مولانا اعظمی کی تعلیق وتصحیح سے حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کی کتاب ''الزہد والرقائق'' ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۶ء) میں شائع ہوئی، اس کے بعد نہ یہاں سے کوئی کتاب شائع ہوئی اور نہ ادارہ کا پتہ چلا، البتہ اس سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی علمی خدمت کا شہرہ ہوا، اور مجلس علمی ڈابھیل کی طرف سے شائع ہونے والی کتب احادیث کی تعلیق وتصحیح کی خدمت انجام دینے لگے، یہ اس ادارہ کی برکت تھی کہ مولانا اعظمی کا علمی مقام تسلیم کیا گیا ورنہ اس سے پہلے ان کے علم کا فیض ''نصرۃ الحدیث'' الاعلام المرفوعہ، رکعات تراویح اور بعض دیگر مختصر رسائل تک محدود تھا، جو مئو میں رہ کر مولانا کے قلم سے نکلے تھے۔

اہل بمبئی کی پیشکش اور میری بے رغبتی:۔ ''انقلاب'' اور'' البلاغ '' کی وجہ سے میرا تعارف شہرت کی حد تک ہر طبقہ میں ہو گیا، عوام خواص، امیر غریب، قدیم وجدید تعلیم یافتہ اور اہل سیاست سب ہی محبت بلکہ عقیدت کا مظاہرہ کرنے لگے، کیونکہ میں خدمت کے طور پر بے لوث کام کرتا تھا، سیٹھوں اور مالداروں سے دور رہ کر اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔

کئی بڑے لوگوں نے خواہش ظاہر کی میں ان کے یہاں آؤں جاؤں یا ان کو اور ان کے بچوں کو ٹیوشن کے طور پر تعلیم دوں، دوسروں سے کہلواتے تھے مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا، حالانکہ پیسہ کمانے کا خوب موقع تھا اور بہت سے مولوی ملا اس طرح کماتے تھے مگر میرا مقصد دولت کمانا نہیں تھا، بلکہ دولت کے شہر میں رہ کر علم دین کی خدمت تھا، البتہ ایک خاندان محمد احمد برادرس (احمد بھائی) سے اس قسم کا تعلق

انجمن خدام النبی اور البلاغ کے ذریعہ پیدا ہوا اور ان حضرات نے میری ہر طرح قدردانی کی اور میرے علمی کام کو آگے بڑھایا، ایک زمانہ میں احمد بھائی مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ کوئی چھوٹی سی فیکٹری لگالیں، فیکٹری ایریا تلاش کریں تاکہ اطمینان وسکون کے ساتھ کام کریں اور معاشی حالت اچھی رہے، ان کے اصرار پر میں بعض جگہ گیا بھی ،مگر چونکہ رجحان نہین تھا اس لئے بیٹھ گیا، حکیم اعظمی صاحب مجھ کو بار بار تاکید کرتے تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور احمد بھائی کی توجہ سے کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگالو۔

بعض احباب خصوصاً ہمارے مخلص دوست قادری صاحب بار بار کہتے تھے کہ میں کمرے کا انتظام کردیتا ہوں بال بچوں کو یہاں بلالیں مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ بمبئی کی زندگی مجھے بالکل پسند نہیں تھی، میں تیس سال بمبئی میں رہا مگر اپنے کو بمبئی والا نہین بنایا اور نہ کبھی وہاں مستقل قیام کا خیال ہوا۔

ایک زمانہ میں انجمن خدام النبی، مسافر خانہ، حج کمیٹی بحری جہاز اور ہوائی جہاز سب سے گہرا تعلق رہا اور ان کے ذمہ داروں سے بھی تعلق رہا، یاروں نے حج کی راہ سے خوب خوب کمایا لال پیلے نوٹ کا دھندا، بلیک، اسمگلنگ اور غیر ملکی کرنسی کے ذریعہ خوب کمایا، مگر الحمدللہ کہ میں نے اور میرے بھائی حیات النبی مرحوم نے اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا۔

محمد علی زنیل علی رضا جوہریؒ:۔ دنیا کے مشہور احجار کریمہ (قیمتی پتھر) کے تاجر محمد علی زنیل علی رضا جوہریؒ دنیا کے مالدار ترین لوگوں میں سے تھے، پہلی بار حکیم اعظمی کے ساتھ ان کے آفس سیتارام بلڈنگ میں گیا، ان کا مزاج خالص عربی تھا، اور شاہانہ بھی، ان سے بعد میں بہت زیادہ تعلق ہوگیا، وہ بڑے قدردان تھے، لوگ ان سے سلام کرنے کو فخر سمجھتے تھے، جب میں جاتا تو بہت خیال کرتے تھے، اور خصوصی توجہ سے بات چیت کرتے تھے، مدرسۃ الفلاح کے نام سے مکہ مکرمہ اور جدہ کی طرح بمبئی میں انھوں نے مدرسۃ الفلاح جاری کیا تھا، استاد احمد فرید صاحب کے ذریعہ مجھ سے

کہلوایا کہ میں ان کے مدرسہ میں تعلیم دوں اور بچوں کو پڑھاؤں ، اس سلطانی پیشکش پر میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معذوری ظاہر کی ، حالانکہ اس تعلق سے میں بڑی دولت کما سکتا تھا، ان کے یہاں کے معمولی معمولی ملازمین لکھ پتی ہو گئے تھے، وہ ان کو علاج کیلئے غیر ممالک بھیجتے تھے۔

شام کے صدر شکری قوالی سرکاری دورہ پر ہندوستان آئے تھے، بمبئی آئے تو محمد علی جوہری صاحب نے ان کی شاندار دعوت کا انتظام کیا اور ان کو عربی میں ایڈریس پیش کیا، اس کو لکھنے کیلئے مجھے بلایا اور گیارہ بجے دن سے گیارہ بجے رات تک ایک جملہ کیلئے روکے رکھا، بڑی محبت اور پیار سے روکا جبراً نہیں، بس وہ جملہ ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، آخر دس بجے رات میں ان کو تسلی ہوئی تو کھانے کیلئے اپنے مکان لے گئے ، موٹر میں لے کر چلے دو چار ملازمین ساتھ تھے، راستہ میں اتر کر ایک مشہور ہوٹل سے بریانی وغیرہ لیتے ، راستہ میں گاڑی روک کر فروٹ لیتے تھے اور فوراً آس پاس کے پولیس اور عوام ان کو گھیر لیتے تھے ، بہرحال کسی طرح گھر پہونچے اور دسترخوان بچھوایا، ساتھ کھانے بیٹھے اور اپنے سامنے سے مختلف قسم کی چیزیں میرے سامنے کرتے رہے ، اسی درمیان ان کی بلّی آگئی تو اس کے کھلانے میں مصروف ہوگئے ، بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، ان میں یہ بات بھی تھی کہ ہم لوگ خالص عرب ہیں مگر چونکہ جواہرات کی تجارت کے سلسلہ میں ہمارا خاندان ایک مدت تک ایران میں مقیم رہا اس لئے یہ نام مشہور ہوا۔

انھوں نے شاہ سعود کی دعوت کی تھی ، شاہ حسین وغیرہ کی بھی دعوت کی تھی ، ہر دعوت میں میرے نام دعوت نامہ بھیجا کرتے تھے۔

فلم والوں کی پیشکش:۔ میری شہرت فلمی دنیا تک ہوگئی اور وہ لوگ بھی تعلق پیدا کرنے کی ترکیب سوچتے تھے، ایک مرتبہ دفتر ''انقلاب'' میں فلم والے آئے اور کہا کہ فلاں فلم کی کہانی کا خلاصہ عربی میں کردیں، پہلے تو میں نے کہا کہ فلم بینی عوام کا

مشغلہ ہے اس لئے عربی عامی ہونی چاہئے اور نئی زبان میں اس کا ترجمہ ہونا چاہئے اور میں پرانی عربی جانتا ہوں، اس جواب پر وہ لوگ چلے گئے، مگر دوسرے دن آ کر کہنے لگے کہ پرانی عربی ہی میں ترجمہ کردیں، اس پر میں نے کہا کہ میں نے عربی دین کی خدمت اور اس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کی، فواحش ومنکرات پھیلانے کیلئے نہیں سیکھی ہے، اور وہ مایوس ہوکر چلے گئے۔

ایک مرتبہ فلم والے دفتر میں آئے اور کہنے لگے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں اور شوٹنگ میں پانچ منٹ حاجی ملنگ کے بارے میں تقریر کردیں، میں نے کہا کہ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں، بمبئی اور اطراف کے بزرگوں کے بارے کچھ نہ کچھ معلومات ہین مگر ان کے بارے میں آج تک کچھ نہیں ملا ہے، میں غلط سلط بات کیسے کہدوں اور پھر فلم کے پردے پر پانچ منٹ کے لئے آ کر اپنا سب کچھ کھودوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔

اسلم لکھنوی انقلاب میں انگریزی خبروں کے مترجم تھے، باندرہ میں رہتے تھے، انھوں نے ایک فلم ایکٹرس کا جو بوڑھی ہوکر نماز وتلاوت میں رہا کرتی تھی، سلام پہونچایا اور اس کا پیغام دیا کہ قاضی صاحب بہت بڑے عالم ہیں اور بڑے باشعور ہیں، وہ ہر جمعہ کو ہمارے یہاں آ کر دینی باتیں بتادیا کریں تو ان کی مہربانی ہوگی، میں نے برجستہ کہا کہ اس سے کہہ دینا کہ اگر تم قاضی صاحب کو اتنا بڑا عالم سمجھتی ہو تو پھر یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ ایسا عالم گانے بجانے والی عورت کے پاس آئے گا، جاکر اس سے یہی کہہ دینا،

ایک مرتبہ کیفی اعظمی صاحب مشہور مغنی اور اداکار محمد رفیع کو انجمن ہائی اسکول لے کر آئے اور مجھ سے کہا کہ ان کیلئے قرآن شریف کی ایسی صورتوں اور آیتوں کا ترجمہ کردیجئے جس میں انسانی مساوات اور یکجہتی کا بیان ہوتا کہ یہ صبح کو ریڈیو پر اس کی تلاوت کریں اور ترجمہ سنائیں تا کہ مسلمان صبح کو ریڈیو کھولیں تو پہلے قرآن شریف

سنیں، میں نے کہا کہ اچھا اب ہم مولویوں کا فریضہ فلم اور ریڈیو والے انجام دیں گے تو ہم لوگ کیا کریں گے؟ اس کو کیفی اعظمی اور محمد رفیع نے مذاق سمجھا، پھر میں نے بتایا کہ تجوید و قرأت ایک مستقل فن ہے، موسیقی اور غناء دوسرا فن ہے، اس لئے پہلے رفیع صاحب باندرہ میں مولانا قاری سید افتخار احمد صاحب کے یہاں قرأت کی مشق کرلیں پھر یہ کام کریں، اس پر وہ لوگ چلے گئے، کچھ دنوں کے بعد قاری سید افتخار احمد صاحب ملے تو انھوں نے کہا کہ کیفی اعظمی اور رفیع میرے پاس آئے تھے اور آپ کی بات نقل کررہے تھے، میں نے ان کو بتادیا کہ اس چکر میں نہ پڑیں، قاری صاحب سے فلم والے بہت مانوس رہا کرتے تھے، جمعہ کی نماز ان کی امامت مین پڑھتے تھے اور ان کا وعظ سنا کرتے تھے۔

دائرۃ المطبوعات و النشر کویت (۱۹۶۰ء):۔استاذ احمد فرید یمانی مرحوم کے پاس دولت کویت کے سلسلہ دائرۃ المطبوعات والنشر کی پہلی کتاب ''الذخائر والتحف'' آئی، میں نے ان سے مطالعہ کیلئے لیا، انھوں نے میرے شوق کا احترام کرتے ہوئے مجھے ہدیہ کردیا، اس کے بعد ۳۰/اکتوبر ۱۹۶۰ء کو میں نے دائرۃ کے مدیر کو خط لکھ کر اس کی مطبوعات کی خواہش ظاہر کی اور ''الذخائر والتحف'' کا حوالہ دیا، تقریباً چار ماہ کے بعد مجھے جواب دیا اور اب تک کی یہ مطبوعات بحری ڈاک سے روانہ کیں، جو مجھ کو ۱۲/جنوری ۱۹۶۱ء کو وصول ہوئیں، (۱)''الذخائر والتحف'' قاضی رشید (۲) الاصول فی اللغۃ، انباری (۳) العبر فی خبر مَن غبر جلد اول، اس کے بعد خط وکتابت اور کتابوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا بلکہ انھوں نے اس ادارہ کا مجھے علمی مشیر بنالیا، یہ ادارہ وزارۃ الارشاد والانباء کے ماتحت ''التراث العربی'' کے عنوان سے جاری تھا۔

امام ذھبیؒ کی العبر فی خبر مَن غبر کا ایک ذیل خود ذھبی نے لکھا تھا، اور ان کے ذیل پر ایک ذیل ۷۴۱ھ سے ۷۶۴ھ تک ابوالمحاسن محمد بن علی بن حسن، شمس

الدین حسینی م ۷۶۵ھ نے لکھا تھا، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ عارف حکمت مدینہ منورہ میں تھا جس کو میں نے ۱۹۵۵ء پہلے حج وزیارت کے موقع پر دیکھا تھا اور دائرۃ المطبوعات والنشر کو اس کی اطلاع کی، اس کا ایک نسخہ ترکی میں تھا، دونوں نسخوں کی مدد سے ذھبی اور حسینی کے دونوں کے ذیل الگ کتابی شکل میں وہیں سے شائع ہوئے، دائرۃ سے کتابوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ میں بمبئی کم رہنے لگا اور بعض کتابیں واپس چلی گئیں تو یہ سلسلہ ختم ہوگیا، آخر میں ''تاج العروس'' کی ابتدائی جلدیں آئیں، ان میں بھی بعض میری عدم موجودگی کی وجہ سے بعض حصے واپس چلے گئے۔

امیر کویت عبداللہ السالم الصباح :۔ امیر کویت کی دو بلڈنگیں بمبئی کے مغربی ساحلِ سمندر پر الصباح کوٹ اور الجابر یہ کوٹ تھیں جن میں اس کے حاکم وامیر عبداللہ السالم الصباح آتے رہتے تھے اور قیام کرتے تھے، میں نے استاذ احمد فرید مرحوم کے ساتھ شعبان ۱۳۸۵ھ (۲۵ر نومبر ۱۹۶۵ء) میں کئی بار ان سے ملاقات کی تھی، وہ بڑے تپاک اور محبت سے ملتے تھے، ایک مرتبہ رجال السند والہند ہدیہ کیا تو دیکھ کر کہا کہ یہ ابن خلکان کے انداز کی کتاب ہے، پھر پوچھا کہ کبھی کویت گئے ہیں یا نہیں؟ میں نے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ وہاں کے دائرۃ المطبوعات والنشر سے میرا علمی تعلق ہے اور وہاں کی تمام مطبوعات میرے پاس ہدیۃً آتی ہیں۔

استاذ سعید رمضان اخوانی :۔ ایک مرتبہ اخوان المسلمین کے سرگرم اور فعال رکن ''المسلون'' جنیوا کے اڈیٹر استاذ سعید رمضان بمبئی آئے، اسلامی جم خانہ چوپاٹی پر ان کو عشائیہ دیا گیا جس میں انھوں نے مسئلہ فلسطین کے بارے میں بتایا کہ ابتداء میں ہمارے عرب دیہاتی ڈنڈے مار مار کر یہودیوں کو ارض مقدس سے بھگا سکتے تھے مگر ہمارے حکمرانون نے نہ خود کچھ کیا اور نہ ہم کو کچھ کرنے دیا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جمال عبدالناصر اخوان المسلمین کے کے خاص ممبروں میں سے تھے

، اور وہ ہمارے تمام پروگراموں اور تحریکی سرگرمیوں سے واقف تھے، ایک رات وہ اخوان المسلمین کی میٹنگ میں شریک ہوئے اور صبح کو اخوان المسلمین کی گرفتاری اور غارت گری کا سلسلہ جاری کر دیا۔

مصطفیٰ احمد سباعی:۔ اس دوران شام کے مشہور عالم و محقق اور ''السنۃ و مکانتھا فی التشریع الاسلامی'' کے مصنف بمبئی آئے اور انجمن خدام النبی میں ان کا استقبال کیا گیا اور انھوں نے خطبہ دیا، تقریر کی۔

جمال عبد الناصر اور قونصل عام عبد المنعم النجار:۔ الجمھوریہ العربیہ المتحدہ مصر کے صدر جمال عبد الناصر ۱۳۷۹ھ (۱۹۶۰ء) میں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے اور ۱۲/شوال ۱۳۷۹ھ، ۹/اپریل ۱۹۶۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ بمبئی کے وفد کے ساتھ گورنر ہاؤس میں ان سے ملاقات کی، رجال السند والہند اور دیوان احمد پیش کیا، میں اور وہ برابر برابر بیٹھے تھے، باتیں کرتے رہے، اس وقت جمہوریہ عربیہ متحدہ مصر کے قونصل استاذ عبد المنعم النجار تھے جن سے میرا گہرا تعلق تھا، اور مصری قراء کی بمبئی آمد پر میرا ان سے تعاون ان کو معلوم تھا، یوں بھی کبھی کبھی مصری قونصل خانہ میں ان سے ملاقات کیلئے جایا تا تھا، انھوں نے رئیس جمال عبد الناصر کی آمد پر یادگار کے طور پر قرآن کریم مع تفسیر صفوۃ البیان فی معانی القرآن مصنفہ شیخ حسنین مخلوف مفتی الدیار المصریہ ہدیہ کی اور شیخ القراء عبد الباسط کی قرأت سے پورا مسجل قرآن دیا، اور بار بار تقاضا کیا کہ اپنے دونوں لڑکوں خالد کمال اور ظفر مسعود میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو میں جامع ازہر میں داخل کرادوں، اس موقع سے فائدہ اٹھائیے، سفارتی سطح کی یہ تجویز بہت وزنی ہے اور فوراً داخلہ ہو جائے گا، مگر میں اس کیلئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ جامع ازہر کے بارے میں معلوم تھا کہ وہاں کے تعلیم یافتہ حد سے زیادہ متنور اور آزاد خیال ہو جاتے ہیں، اس وقت کے ازہریوں کا یہی حال تھا، اس کے چند دن کے بعد استاذ عبد المنعم النجار ہانگ کانگ کے سفیر بن کر چلے گئے۔

مدرسہ کویتیہ اور استاذ مدحت اسمٰعیل:۔ چرچ گیٹ اسٹیشن کے قریب اسی کالج کے سامنے ایک عمارت میں مدرسہ کویتیہ جاری تھا جس میں بمبئی کے عربوں کے بچے بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں، ایک مصری استاذ مدحت اسمٰعیل دوسرے محمد ثابت اس کے معلم تھے، مغرب کے وقت باذوق عرب وہاں جمع ہوکر تبادلہ خیالات کرتے تھے اور چائے کا دور چلتا تھا، عربی اخبارات بھی آتے تھے، ایک زمانہ میں میں بھی اکثر مغرب کی نماز وہیں پڑھتا تھا، ۱۹۵۶ء میں اسرائیل، برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر مل کر حملہ کردیا جس میں ان کی فوجوں کی پسپائی ہوگئی، اس سلسلہ میں مسلمانان بمبئی ایک عظیم الشان جلسہ مستان تالاب پر ہوا، استاذ اور مدحت اسمٰعیل نے عربی میں بڑی ولولہ انگیز تقریر کی، میں نے اس کا ترجمہ اسی انداز میں کیا، وہ چند جملے بول کر خاموش ہوجاتے تھے اور جب میں اس کا ترجمہ کرلیتا تھا تو پھر بولتے تھے، اس رات بمبئی کے عوام نے مدحت اسماعیل اور میرے ساتھ بے پناہ عقیدت اور محبت کا مظاہرہ کیا، عوام وخواص ہم لوگوں پر سلام ومصافحہ کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے، اعظم گڈھ والے الگ اپنے علاقے کے عالم پر فخر کرتے تھے، یہ جلسہ بہت ہی جذباتی قسم کا تھا، بمبئی والے یوں بھی وقتی جوش دکھانے میں مشہور ہیں۔

مصر کا مرکز ثقافی بمبئی میں:۔ جمال عبدالناصر کے دورۂ ہندوستان کے بعد بمبئی میں حکومت مصر کی طرف سے ایک مرکز ثقافی جھانسی کیسل میں قائم ہوا، عظیم الشان لائبریری جاری ہوئی، اخبارات ورسائل آنے لگے، اور متعدد مصری عہدیدار اور ملازم رکھے گئے۔ کتابوں کی وجہ سے میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اور تمام عملہ سے اچھا خاصا تعارف ہوگیا تھا۔

مصریوں کا جھگڑا:۔ اس زمانہ میں یمن کی زیدی حکومت اور مصر کی حکومت کے درمیان باہمی تعاون تھا، اس وقت یمن کے زیدی حاکم غالباً امام حمیدالدین تھے، انھوں نے ایک طویل قصیدہ اسلامی محاسن ومفاخر کے بارے میں لکھا اور اس میں کچھ

سیاسی باتیں بھی جمال عبدالناصر کے نزدیک قابل اعتراض تھیں اور انھوں نے اس بنا پر یمن کی زیدی حکومت سے تعلق ختم کر کے نہایت سخت رویہ اختیار کیا، اس پر میں نے انقلاب میں امام یمن کی طرفداری میں سخت قسم کا نوٹ لکھا جس پر مدرسہ کویتیہ اور مرکز ثقافی کے بعض ارکان میرے خلاف سخت سست باتیں کرنے لگے اور معاملہ شدت اختیار کر گیا، نیز مرکز ثقافی کے ملازمین آپس میں لڑنے لگے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرنے لگے، ایک طبقہ نے مجھسے کہا کہ ہم آپ کو مصر بھیجتے ہیں تا کہ آپ وہاں کے ذمہ داروں سے ان جھگڑوں کی صحیح نوعیت بیان کر دیں، مگر میں مصریوں کے باہمی جھگڑے میں نہیں پڑا، نتیجہ ہوا کہ مصریوں کی لڑائی میں ''مرکز ثقافی'' بند ہو گیا اور اسکی تمام کتابیں تتر بتر ہو گئیں، بہت کم واپس جا سکیں۔

قضیۂ تصاویر:۔ اس مرکز میں سیرت نبوی پر ایک کتاب بچوں کے لئے محمد برانق کی بہت مفید اور سہل زبان میں بیس پچیس چھوٹے بڑے اجزاء میں باتصویر تھی، اس میں مغربی تقلید میں جگہ جگہ انبیاء وعلی مرتضٰی کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت زینب اور بعض دوسرے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی قلمی تصویریں تھیں، اوران کے نیچے ان کے نام تھے، اس زمانہ میں ہندوستان میں رسول اللہ ﷺ کی تصویر پر سخت احتجاج ہوتا تھا، جو غیر مسلم اخبارات دانستہ یا نادانستہ طور پر چھاپتے تھے، میں اس سلسلہ میں کتاب کو لایا اور دیکھ کر سخت اضطراب ہوا کہ اگر غیر مسلم اس کو دیکھ لیں گے تو ان کو دلیل مل جائے اور قبۃ الاسلام قاہرہ اور جامع ازہر سے نکلی ہوئی اس کتاب میں ان لوگوں کی تصویریں ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں اور عالموں کو جوابدہی میں بہرحال دقت ہوگی اور یہ بات ہو یا نہ ہو، اسلام کی تصویر حرام ہے، پھر حضرات انبیاء وصحابہ کی تصویر چھاپنا بڑی جرأت کی بات ہے، اس لئے میں نے انقلاب میں ان تصویروں کی نشاندہی کر کے سخت قسم کا مضمون لکھا اس سے پہلے میری مخالفت میں بعض مصری پیش پیش تھے، یمن کے قضیہ کی وجہ سے، اب ان کو اور بھی طیش آیا اور میرے مضمون کے جواب میں عربی

میں مضمون لکھا جس کا ترجمہ میں نے خود کر کے انقلاب میں شائع کیا اور اس کا جواب الجواب لکھا، بات بہت بڑھ گئی، بعض لوگ مجھے ڈراتے تھے کہ ہندوستان اور مصر کے تعلقات جواہر لال اور جمال عبد الناصر کی حکمت عملی سے نہایت خوشگوار ہیں، ان پر آپ کی تحریر سے برا اثر پڑ سکتا ہے اور حکومت ہند آپ کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے، آخر استاذ عبد العزیز عزت درمیان میں پڑے اور مصری قونصل خانہ کے قنصل ممدوح عزت نے مجھے بلایا اور بڑے ادب واحترام سے بات چیت کی، اور کہا کہ اپنے اعتراضات مجھے دیں، میں ان کو مجمع البحوث الاسلامیہ کے پاس بھیج کر جواب طلب کروں گا، چنانچہ انھوں نے میرے اعتراضات کا ترجمہ کرا کے قاہرہ بھیجا اور کئی مہینے کے بعد وہاں سے طول طویل جواب عربی اور انگریزی میں آیا، جس میں مختلف قسم کی تاویل کے باوجود یہ اقرار کیا گیا کہ آئندہ ان تصویروں کے نیچے نام نہیں لکھے جائیں گے، میں نے ان کا یہ جواب انقلاب اور البلاغ دونوں میں شائع کر دیا، اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

<u>ریاست جنجیرہ کی تاریخ</u>:۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں کوکن کے پہاڑی ساحل پر ریاست جنجیرہ کا قیام ہوا، سلاطین احمد نگر کے ہر عامل یہاں کے دندا تاج ہوری کے قلعہ میں رہتے تھے جو ساحل سمندر کے تھوڑی دوری پر ایک بستی کی شکل میں ہے، میں اس میں گیا ہوں، یہ جزیرہ تھا جو مقامی کوکنی زبان میں جنجیرہ ہو گیا، جب شیوا جی نے حملہ کیا تو اندر فوجوں نے مقابلہ کر کے پسپا کر دیا، یہاں کا امیر اور فوج سیدی تھے، یعنی وہ حبشی جو سلاطین گجرات کے زمانہ میں یہاں فوج وغیرہ میں تھے اور آباد ہو گئے تھے، ان کی دو ریاستیں بعد میں ہوئیں، ایک گجرات میں ''سچین'' معمولی سی، اور دوسری جزیرہ حبشاں (جزیرہ، جنجیرہ) تھا، سیدیوں نے اس قلعہ پر قبضہ کر کے عالمگیر کی مدد کی اور اور باقی تین تعلقے یہ تھے، قلایہ، مہسلہ، مروڈ، میں نے اس ریاست کی تاریخ کیلئے کافی مواد جمع کر لیا تھا، بعد میں ایک عزیز عبد الشکور قادری ام، اے نے

طلب کیا میں مرتب کروں گا مگر وہ مرتب نہ کر سکے اور نہ مسودات مجھے دے سکے، البتہ رسالہ ''صبح امید'' کے اڈیٹر عبدالحمید بوہرے نے میرا ایک مضمون اپنی کتاب ''تاریخ قوم کوکنی'' میں شامل کیا۔

عبدالحمید بوہرے:۔ عبدالحمید بوہرے ادیب تھے، مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، دور ہی دیکھ کر پکار اٹھتے ''بیا بیا برادر تو زخاصگان مائی'' (آجاؤ بھائی! تم تو میرے خاص لوگوں میں سے ہو) کبھی کبھی میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا، پنویل کے رہنے والے تھے۔

زاہد شوکت علی:۔ اس زمانہ میں خلافت ھاؤس اور اخبار خلافت پر مولانا شوکت صاحب کے صاحبزادے زاہد صاحب قابض تھے، بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے، حکومت کے ارکان ان کا لحاظ کیا کرتے تھے، مگر کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

روزنامہ ہندوستان کے مدیر و مالک آورزو صاحب رامپوری بھی بڑے خلوص ومحبت سے ملتے تھے، وہ کچھ عربیت سے واقف تھے، اس لئے کبھی کبھی اس کا اظہار کیا کرتے تھے۔

وجد حیدرآبادی:۔ مشہور شاعر علی سکندر وجد حیدرآبادی اورنگ آبادی سے مکتبہ جامعہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی، وہ کسی زمانہ میں کلکٹر رہ چکے تھے، عثمانیہ یونیورسٹی میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے شاگرد رہ چکے تھے، اس لئے مولویوں سے تعلق رکھتے تھے، ''اجنتا'' ان کی مشہور نظم ہے۔ سید اشفاق حسین (اکسپریس بلاک) کے یہاں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔

سید اشفاق حسین:۔ سید اشفاق حسین صاحب کے بچوں کو میں ہفتہ میں ایک دن تعلیم دیتا تھا، سید آصف حسین، سید خالد حسین میرے تلامذہ میں ہیں اور خصوصی تعلق رکھتے ہیں، مدرسہ حجازیہ میں تعاون بھی کرتے ہیں۔

مولانا شہاب مہر مالیر کوٹلوی:۔ جناب مولانا شہاب مہر مالیر کوٹلہ کے، بمبئی کے کسی اسکول میں فارسی کے مدرس رہ چکے تھے، غالبًا باقاعدہ عالم نہیں تھے، مدت دراز سے بمبئی میں رہتے تھے اور وہاں کے جدید حلقوں میں کافی شہرت رکھتے تھے، پہلے قادیانی تھے، بمبئی سے کوئی رسالہ بھی جاری کیا تھا، آخر میں غالبًا اہلحدیث ہوگئے تھے اور ان کے ایک آدمی سے معلوم ہوا کہ وہ بہائی فرقہ سے متعلق ہوگئے تھے، آخر وقت تک ہدایت سے محروم رہے، الٹی سیدھی باتیں کرتے تھے، مجھ سے بڑے انشراح سے پیش آتے تھے اور میرے مضامین انقلاب ومعارف وغیرہ میں پڑھتے تھے، جب مولانا عبدالماجد دریابادیؒ میری کتاب پر تبصرہ کرتے تو شہاب صاحب دور ہی سے مبارکباد دیتے اور کہتے تھے کہ مولوی عبدالماجد قلم کے بہت بخیل ہیں، مگر آپ کے بارے میں بہت سخی ہیں، آپ کی فلاں کتاب کی خوب خوب تعریف کی ہے۔

معین الدین حارث جامعی:۔ روزنامہ اجمل کے مدیر ومالک جناب معین الدین حارث جامعی سوشلسٹ پارٹی میں تھے، متشرع، نماز روزہ کے پابند، آخر میں حج کمیٹی کے چیرمین تھے، دینی جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اچھے مقرر تھے اور اصول کے بیحد پابند تھے اس لئے کسی کو ان سے کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوسکا اور اپنی دینداری، پابندی اور اصول پرستی کی انتہا کی وجہ سے عوام وخواص میں مشہور تو ہوئے مگر مقبول نہیں ہوسکے، اتنی خشکی بھی اچھی نہیں ہے۔

علامہ احمد شُبیلی:۔ علامہ احمد شُبیلی کا نام زمانہ طالب علمی میں مولانا عبدالشکور لکھنوی اور مولانا نثار احمد کانپوری کے مابین بمبئی میں علم غیب کے موضوع پر سنا تھا وہ حکم تھے، بمبئی گیا تو ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، وہ بعض مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور ''صبح امید'' میں معمولی قصے کہانی لکھا کرتے تھے، وہ سلطان مسقط کے معتمد کی حیثیت سے تھے، اسی علاقہ کے رہنے والے تھے، مگر اردو میں شاعری اور مضمون نگاری کرتے تھے، ان میں زیادہ پڑھے لکھے آدمی شان نہیں تھی، مسلک کے

اعتبار سے خارجی ہونا چاہئے تھا، عربی ادب سے بھی زیادہ تعلق نہیں تھا، وہ بمبئی کے علامہ تھے۔

سلطان مسقط سعید تیمور:۔ انگریزوں نے سلطان مسقط سعید تیمور صاحب کو معزول کر کے بمبئی میں رکھا تھا، معمولی سا وظیفہ تھا، سفید شیروانی، پائجامہ کرتہ پہنتے تھے، بعض اوقات استاذ احمد فرید کے یہاں آتے تھے اور وہ سو دو سو روپیہ دیدیا کرتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ اردو کیوں نہیں سیکھ لیتے ہیں، تو انھوں نے علامہ احمد شبیلی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ نہیں سکھاتے ہیں، بمبئی میں انتقال کیا، ایک سلطان کو فقیر بنتے میں نے دیکھا ہے، رحم آتا تھا۔

امیر قطر ہندوستان میں:۔ امیر قطر ہندوستان کے سرکاری دورہ پر آئے، بمبئی میں انجمن خدام النبی کے اراکین نے ان کے استقبال میں مسافر خانہ کے سامنے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں امیر قطر نے جوابی تقریر کی، میں نے ان کی تقریر کا ترجمہ کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا، دوسرے دن ان کی قیامگاہ پر محترم احمد بھائی وغیرہ ملاقات کیلئے گئے، دیر تک بات ہوتی رہی، وہ نادر و نایاب کتابوں کو خریدنا چاہتے تھے، احمد بھائی نے سورۂ یٰسین شریف کا وہ نسخہ پیش کیا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس میں موجود ہے، اور اس سے عکس لے کر گزشتہ صدی میں ایک روسی عالم نے بعینہٖ اس کو چھاپا تھا، انھوں نے قیمت معلوم کی تو احمد بھائی نے شاہی حساب سے اس کی قیمت بتائی اور انھوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا، اس سورہ شریف پر میرا مستقل مقالہ معارف میں چھپ چکا ہے، امیر قطر نے غالباً بیس ہزار روپیہ مسافر خانہ کو عطیہ دیا تھا۔

شاہ حسین والی اردن:۔ شاہ حسین والی اردن بمبئی آئے، جناب محمد علی زنیل علی رضا صاحب نے کو شاہی انداز کی دعوت دی، میرے پاس بھی دعوت نامہ بھیجا مگر میں اس میں شریک نہیں ہوا، کیونکہ شاہ حسین کے اعزاز میں انڈو عرب سوسائٹی کی

طرف سے رقص وسرود کا پروگرام ہوا تھا، اس سے مجھے انقباض تھا۔

رضا شاہ پہلوی:۔اسی طرح شاہ ایران رضا شاہ پہلوی بمبئی آئے ، جناب محمد علی زنیل علی رضا صاحب نے ان کی بھی شاندار دعوت کی ،اور مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا مگر میں اس میں بھی شریک نہیں ہوا، کیونکہ اس کی آمد پر تین دن کیلئے بمبئی میں شراب بندی ختم کردی گئی تھی۔

شاہ افغانستان:۔ شاہ افغانستان کی آمد پر کیسر باغ میں استقبالی جلسہ ہوا، میں بھی اس میں شریک تھا، وہ مغربی لباس میں معمولی حیثیت کے آدمی معلوم ہوتے تھے،

شکری قواتلی صدر شام:۔شکری قواتلی صدر شام کا استقبالیہ جلسہ بھی اسی باغ میں ہوا تھا، بمبئی کے گورنر شری پرکاش رائے (بنارس والے) نے تقریر میں کہا کہ ہم آپ کا استقبال ایسے شہر میں کررہے ہیں جس کا بجٹ آپ کے ملک شام سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق مدراسی اور مولانا عبدالوہاب بخاری:۔ایک دن دفتر ''انقلاب'' میں ڈاکٹر عبدالحق مدراسی اور مولانا عبدالوہاب بخاری پرنسپل نیو کالج مدراس تشریف لائے ، کسی دینی ادارہ کے لئے مالیات کی فراہمی کے سلسلہ میں نوٹ لکھانا تھا ، میں نے لکھا ، ان حضرات سے پہلی ملاقات تھی ، یہ ۱۹۵۶ء سے پہلے کی بات ہے ، اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان دونوں حضرات سے ملاقات ہوتی رہی ، ڈاکٹر صاحب اکثر بمبئی تشریف لایا کرتے تھے یونیورسٹی کے کام سے ،انجمن خدام النبی اور ابنائے مولوی غلام رسول سورتی کے یہاں اکثر ملاقات ہوتی تھی ، ۱۹۶۵ء کے سفر حج میں بحری جہاز میں ہفتوں ساتھ رہا، علمی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مدراس آؤ میرے کتب خانہ سے استفادہ کرو ، جہاز میں میری تقریر ہوتی تھی ، یہ حضرات دوسرے مدراسی علماء واعیان کے ساتھ رہا کرتے تھے ، دونوں حضرات خوردنوازی اور شفقت سے پیش آتے تھے، ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے

بھی بمبئی میں ملے جنھوں نے ایک انگریز عورت کو مسلمان کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔

مولانا محمد یوسف کوکنی عمری مدراسی:۔ مولانا محمد یوسف کوکنی عمری سے بمبئی میں اکثر ملاقات ہوتی تھی، وہ بمبئی یونیورسٹی میں آیا کرتے تھے، بعد میں ان سے بہت تعلق پیدا ہو گیا تھا، مدراس حاضری کے وقت ان کے یہاں بھی حاضری ہوئی، انھوں نے اپنی تصانیف پیش کی، وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ میں رہ چکے تھے، یہیں امام ابن تیمیہ نامی کتاب لکھی تھی، جسے مجھے عنایت کیا، ان کو اعظم گڈھ کے ساتھ خاص محبت تھی، بعد میں اس کی انتظامیہ کے رکن تھے، اور کمیٹی میں آیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ میرے یہاں مبارکپور بھی آئے تھے۔

مولانا عبدالباری حاوی:۔ مولانا عبدالباری حاوی مدراس کے مشہور اہل علم میں سے تھے، ان سے بمبئی ملاقاتیں ہوتی تھیں اور خاص تعلق ہو گیا تھا، عربی کے ادیب وشاعر تھے، حجاز وحج سے خاص تعلق تھا، ان کے صاحبزادے مولوی عبدالباقی سلمہٗ ہیں، مدراس میں ان کے یہان قیام رہا،

مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی:۔ حج میں جہاز پر مولانا صبغۃ اللہ بختیاری مدراسی سے ملاقات ہوئی، وہ پہلے جماعت اسلامی کے سرگرم رکن تھے بعد میں الگ ہو گئے، علمی اور روحانی عالم ہیں، بڑے دلچسپ مجذوب قسم کے ہیں، ''معہدِ احسانی'' کے نام سے کٹر تا مدراس میں ادارہ قائم کیا ہے، بعد میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے، بڑی محبت وخلوص سے بات کرتے ہیں، مجھ کو ''ابوذر غفاری'' سے تشبیہ دیتے ہیں، کہا کرتے تھے کہ مولویوں کے ''ھمز ولمز'' سے اللہ بچائے، ان کے ہم درس وہم عصر احباب ان سے تفریح کرتے تھے۔

(قاضی صاحب کی غیر مطبوعہ خودنوشت سوانح ''کاروانِ حیات'' یہیں پر ختم ہو جاتی ہے، اب آگے کے حالات ہم مطبوعہ خودنوشت سوانح ''قاعدہ

بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے تکملہ ''فراغت کے بعد کا علمی سلسلۂ حیات''
سے نقل کر رہے ہیں۔ مدیر)

تیس سال سے زائد مدت تک بمبئی میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں علامہ شبلی مرحوم ''کنار آب چوپاٹی وگل گشت اپالو'' کی سیر کرکے غزل کہا کرتے تھے، ان کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں ''مرکز علمی'' کا بورڈ لگا کر تصنیف وتالیف اور مضمون نگاری ومقالہ نویسی کا دور شباب گذارا، میں نے بڑے بڑے عقیدتمندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیشکش کرنے والوں کی پیشکش کا شکریہ ادا کرکے شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلہ میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی، میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ واحباب اس معاملہ میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اس بارے میں اپنے کو عقلمند سمجھتا تھا بلکہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

بمبئی غریب پرور ہونے کے ساتھ علم کُش شہر ہے، جس کا احساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا، اس لئے میں نے دولت وثروت کے اس ''اندرونِ قعرِ دریا'' میں تیس سال سے زائد ''تختہ بند'' ہونے کے باوجود اپنے دامن علم کو تر نہیں ہونے دیا، اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود عرب وہند کے ابتدائی چار سوسالہ تعلقات پر عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ نے ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کے پیش لفظ میں تحریر فرمایا کہ ''اس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اس بے آب وگیاہ صحرا میں تنہا چلے، اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا ایک پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے'' اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں،

(اسکے بعد اس دوران شائع شدہ کتابوں کا تذکرہ ہے، ان کا ذکر دوسرے کسی مضمون میں مستقلاً آئے گا، اور بعض کا ذکر تفصیل سے اسی میں آچکا ہے، اس کے آگے قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔)

دینی وعلمی اسفار:۔ اپنے کاموں میں انہماک کی وجہ سے اِدھر اُدھر آنے جانے سے بچنے کے باوجود اندرونِ ملک کے مختلف شہر اور مقامات کا بہت سفر ہوا، غیر ملکی سفر کی ابتداء حج وزیارت کے مبارک سفر سے ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پانچ بار حج وزیارت اور عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، پہلا حج ۱۳۷۵ھ میں، دوسرا حج ۱۳۸۵ھ میں تیسرا حج ۱۳۹۳ھ میں، چوتھا حج ۱۳۹۷ھ میں، اور پانچواں حج ۱۴۰۲ھ میں کیا، اب کے بار امیر الحج بنایا گیا تھا، چوتھے حج ۱۳۹۷ھ (۱۹۷۶ء) کے بعد عزیزم خالد کمال سلمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بلاد عرب وافریقہ کا چھ ماہ تک ذاتی سفر کیا، اور جن مقامات میں گیا وہاں کے اہل علم اور کتب خانوں سے استفادہ کرتا رہا اس سفر میں سعودی عرب میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، طائف، الخبر، دمّام، ریاض، اور درعیّہ گیا، دمام سے ریاض تک ریل سے سفر کیا، یہاں سے کویت گئے جو ملک بھی ہے اور شہر بھی، قیام مرکز دعوت الارشاد میں تھا، امیر کویت کے انتقال کی وجہ سے عام بندی تھی، بعض اہل علم سے ملاقات ہوئی اور بعض کتب خانوں میں جانا ہوا، ادارۂ التراث العربی میں نہیں جا سکا جس کا مین مشیر علمی تھا۔ دو دن کے بعد دمشق گئے مگر وہاں کے حکام نے ہوائی اڈہ سے باہر نہیں جانے دیا، اور شام سے مصر کیلئے روانہ ہو گئے ،وہاں قاہرہ کے میدان عتبہ میں کرنک ہوٹل میں کئی دن قیام رہا، جامع ازہر اور وہاں کے علماء، اساتذہ اور تلامذہ سے ملاقاتیں رہیں، قاہرہ سے متصل فسطاط اور جیزہ کے علاوہ حلوان اور اسکندریہ بھی جانا ہوا، پورا شہر قاہرہ دارالعلم اور دارالکتب معلوم ہوتا تھا، متحف قبطی (قبطی عجائب خانہ) کی کئی منزلہ شاندار عمارت مین فراعنۂ مصر کے مجسمے، ان کے استعمالی سامان اور حنوط کی ہوئی ان کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں، اوپر کی منزل میں چودہ فرعونوں کی لاشیں صندوقوں میں قطار سے پڑی ہوئی ہیں جن میں فرعونِ موسیٰ کی لاش بھی ہے، اہرام اور ابوالہول عبرت گاہ ہیں۔ فسطاط کی جامع عمرو بن عاصؓ میں نماز پڑھی، اس کے ایک گوشہ میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا مزار لکڑی کے حظیرے میں

ہے، اسی علاقہ میں امام شافعیؒ کا بھی مزار ہے، کشتی میں بیٹھ کر دریائے نیل پار کیا، مصر سے گھانا (مغربی افریقہ) کا سفر ہوا جہاں عزیز مولوی خالد کمال دارالافتاء کی طرف سے مبعوث تھے، اس کے دارالحکومت ''اکرا'' میں کئی ماہ قیام رہا اور وہاں کی بام یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبۂ عربی سے خوب خوب استفادہ کیا، امام سمعانیؒ کی کتاب'' الاملاء والاستملاء'' نقل کی، ابن حوقل کی کتاب ''صورالارض'' ابن اخوہ کی کتاب ''معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ'' وغیرہ سے اقتباسات نقل کئے، علمائے اندلس کی کئی کتابوں کے عکسی فوٹو کی زیارت کی، مشہور ماہر بحریات ماجد نجدی کی متعدد کتابیں یہاں موجود ہیں، کوماسی، کیپ، کوسٹ، تمالے اور شمالی علاقوں کا ہفتوں تک دورہ کیا، اسی سے متصل ٹوجو (لومی) کی سیاحت کی، واپس قاہرہ آکر رجال السند والہند کی طباعت کا معاملہ دارالانصار سے طے کیا، ہوٹل لوسکی میں کئی دن قیام رہا، طبقات المفسرین داؤدی، کتاب البرہان والعمیان جاحظ، اور بعض دوسری کتابیں خریدیں، قاہرہ میں الاستاذ عبدالمنعم النمر، شیخ صلاح ابواسمٰعیل مصری اور ڈاکٹر عبد العزیز عزت سے بار بار ملنا جلنا ہوتا تھا، اکثر وقت جامع ازہر کے اداروں اور کتب خانوں میں گذرتا تھا، قاہرہ سے اردن کیلئے روانہ ہوئے، دارالسلطنت عمان پہاڑ و ن کے نشیب وفراز میں آباد ہے، یہاں خندق ابراہیم میں قیام رہا، یہاں سے ملک شام کیلئے کوشش کی مگر ناکامی رہی، حکومت اردن کی اجازت سے بیت المقدس میں حاضری کا ارادہ کیا اور ارضِ محتلہ میں داخل ہوگئے، مگر اسرائیل نے واپس کردیا، اردن یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی، ادارۂ شئونِ اسلامیہ واوقاف نے اپنی مطبوعات دیں، ایک دن زرقاء جانا ہوا، وہاں کوئی مسجد نظر نہیں آئی اور کئی گرجے دیکھے، اردن میں رومیوں کے قدیم مدرج اور آثار بہت زیادہ ہیں، عجائب خانہ میں اموی خلفاء وامراء کے لباس اور استعمالی ظروف موجود ہیں۔

یہاں سے بذریعہ ٹیکسی سعودی عرب کیلئے روانہ ہوئے، راستہ میں معان، قلعہ

کرک وغیرہ آئے ، عصر اور مغرب کے درمیان مقامِ حجر سے گذرے جو قومِ ثمود کا مسکن تھا، سلسلہ کوہ دور تک چلا گیا ہے۔

درمیان میں سڑک ہے پہاڑوں میں قومِ ثمود کے مساکن کے آثار نظر آتے تھے، رمالِ متحرکہ جگہ جگہ تودے کی شکل میں تھے، سرِ شام سعودی عرب کی سرحد حالۃ عمار سے گذرے، تبوک سے دوسری ٹیکسی پر چلے ، رات میں مقام العلاء سے گذرے جو بارونق شہر ہے، اس علاقہ کو کتابوں میں ''قریٰ عربیہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، خیبر سے گذرتے ہوئے مدینہ منورہ پہونچے، دو چار دن قیام کر کے مکہ مکرمہ اور وہاں سے جدّہ آئے ، استاد عبدالقدوس انصاری مرحوم مدیر مجلّہ ''المنہل'' نے اپنی جملہ تصانیف ہدیہ میں عنایت کیں، ریاض پہونچ کر فندق التاج الجدید میں دارالافتاء کی طرف سے قیام ہوا، مؤرخ الجزیرہ استاد احمد الجاسر نے دارالیمامہ کی مطبوعات و منشورات ہدیۃً دیں ، دار عبدالعزیز کے مدیر محترم نے اس کی مطبوعات پیش کیں، اور فضیلۃ الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ نے اپنی تصانیف و مطبوعات کا ایک معتد بہ حصہ عنایت فرمایا، وہاں کے بعض کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

ریاض سے کراچی آئے ، مکتبہ عارفین جا کر اپنی کتابیں طلب کیں جن کو انھوں نے چھاپا تھا تو دونوں کتاب کا ایک ایک نسخہ دیا جس پر ''حق تصنیف'' لکھا تھا، مجھے یہ دیکھ کر طیش آیا اور اس تحریر کو کٹوایا، دودن وہاں رہ کر لاہور آئے ،مگر میرے دور کا لاہور مجھ کو نہیں ملا، گرمی سخت تھی دوسرے دن دہلی آ گئے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر و نظر سکھر کی دعوت پر ہندوستان کے ایک علمی وفد کے ساتھ سندھی ادبی میلہ کے اجلاس میں شرکت ہوئی اور جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم صدر پاکستان کی زیرِ صدارت جلسہ ہوا، جس میں صدرِ محترم کے ہاتھوں سندھ کی روایتی ٹوپی اور تنظیم فکر و نظر کا اعزازی نشان دیا گیا، اور ان کے حکم سے ارکان وفد کو سرکاری مہمان کی حیثیت سے دورہ کرایا گیا، اس سلسلہ میں کراچی ،ٹھٹھ، دیبل ، لاہور، اسلام آباد،

ٹیکسلا، پشاور، بلوچستان، کوئٹہ، لاڑکانہ، موہن جوداڑو (مون جودڑو یعنی موت کا ٹیلہ) سکھر، اڑورہ، نواب شاہ اور حیدرآباد وغیرہ کی سیاحت کی، اڑورہ (جس کو عربی تاریخوں میں اَلُور لکھتے ہیں) کراچی اور ٹھٹھ کے درمیان دیبل دونوں کے کھنڈروں میں حضرت محمد بن قاسمؒ کی مسجد کی جگہ نمایاں تھی دونوں مقام پر دو دو رکعت نماز پڑھی، اس بار بھی لاہور جانے کے باوجود اپنی قیام گاہ اور اخبار ''زمزم'' کا آفس نہ پا سکا۔

۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد میں تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں شرکت ہوئی، دونوں کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم شریک تھے، ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی، مرحوم سے جو شخص ایک بار ملتا تھا محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے خاص تعلق رکھتے ہیں، یہ مرحوم کے اخلاق کی خوبی تھی، میں بھی یہی محسوس کرتا تھا، انھوں نے مجھے ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلّیٰ اور ایک حمائل شریف ہدیہ دیا ہے، ان سے خصوصی مجلسوں میں بار بار ملاقات ہوتی رہی،

اگست ۱۹۸۶ء میں تنظیم فکر ونظر سندھ نے میری کتابیں چھاپیں اور ان کے رسمِ اجراء میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مجھے دعوت دی، وزیر اعلیٰ سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت مین تاج محل ہوٹل کراچی میں نہایت شاندار جلسہ ہوا، جس میں پاکستان کے مشہور ماہر قانون جناب خالد ایم اسحاق، پروفیسر سراج منیر مرحوم، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، پروفیسر ذیشان خٹک، چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور، ماہر سندھیات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر ایاز کراچی یونیورسٹی وغیرہ نے ان کتابوں اور اس کے مصنف کے بارے میں اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا، اسی سلسلہ کا دوسرا جلسہ تنظیم فکر ونظر کے صدر مقام سکھر میں ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت ہوئی

جن اداروں سے تعلق تھا یا اب بھی باقی ہے:۔ جن علمی اداروں سے پہلے تعلق رہا ہے اور ان مین رہ کر مفوضہ خدمت انجام دی ہے، وہ یہ ہیں، معتمد انجمن

تعمیرات ادب مُزنگ لاہور، مشیر علمی ادارہ التراث العربی کویت، صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر بمبئی، صدر دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر، رکن انجمن خدام النبی بمبئی، رکن رویت ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی، اور فی الحال رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، مشرف شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند، اعزازی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ، اعزازی مدیر ''برہان'' دہلی، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، رکن مجلس شوریٰ جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور (بہار)

حکومت کی قدر شناسی:۔ ۱۵/اگست ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے عربی زبان اور علمی شغف پر توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپئے سالانہ تا حیات پیش کش ہوئی، ۱۹۸۸ء سے یہ رقم دس ہزار ہوگئی ہے۔

۞۞۞۞۞۞۞

اہل حرمین سے ملاقاتیں

مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

ہندوستانی علماء کرام جو زندگی بھر علوم دینیہ کو عربی زبان میں پڑھتے پڑھاتے ہیں، چونکہ انھیں عربی میں گفتگو کرنے کی مزاولت نہیں ہوتی، اس لئے حج کے موقع پر گوکہ ان کی ملاقاتیں عرب علماء سے ہوتی ہیں، لیکن عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اظہار خیال نہیں کرپاتے، اوران کا علم اوران کی ذہانت ''کنز مخفی'' بن کررہ جاتی ہے، اس بات کا احساس اکثر وبیشتر علماء کو رہا کرتا تھا۔

اسی تأثر کا اظہار محترم احمد غریب صاحب نے اپنے ایک خط میں کیا تھا، قاضی صاحب جب حج کو گئے، تو وہ عرب علماء سے بے تکلفانہ ملے، ان سے کھل کر اظہار خیال کیا، کیونکہ عربی لکھنے اور بولنے کا انھیں ملکہ تھا۔ اس سے عرب علماء متأثر ہوئے، قاضی صاحب نے اپنے اس مضمون میں اسی کی داستان بیان فرمائی ہے۔

فروری کے ''البلاغ'' میں محترم احمد بھائی صاحب کا ایک خط ''مکتوب مکہ مکرمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے ہندو پاکستان کے علماء کے عربی میں بات چیت نہ کرنے پر اظہار خیال فرمایا ہے(۱)، ان کی علمی و دینی حمیت نے ہمیشہ یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی ہے کہ ہمارے علماء عربی زبان حاصل کرنے اور اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مدت العمر رہنے کے باوجود اس پر

---

(۱) بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحبزادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کرلی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام وفضلائے عظام میں جو کمی محسوس کررہا تھا عربی بول چال میں کی، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کرلی ہے، عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کرلیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی، ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان وپاکستان کے علماء کو مدعو کیا، اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی وعجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں، کیونکہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں۔

قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے عرب علماء کے سامنے بے زبان بن جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بڑی حد تک دیارِ عرب کے علماء ہندوستانی علماء کو کچھ یوں ہی سا سمجھتے ہیں، جو شخص کسی زبان کو زندگی بھر پڑھے پڑھائے وہ بہر حال اس میں بات چیت کرنے پر کچھ نہ کچھ قدرت رکھتا ہوگا، اگر نہیں رکھتا تو اسے رکھنا چاہئے، موصوف نے جب اپنے حلقہ کے ایک طالب علم (عزیزم خالد کمال مبارکپوری) کو اس معاملہ میں چند ہی سالوں میں مدینہ منورہ میں رہ کر بہت آگے پایا تو اپنے ذوق میں ایک اہتزاز اور نشاط محسوس کرتے ہوئے اس کا نہایت اچھے انداز میں اظہار فرمایا، اور ہمت افزائی کی، محترم احمد بھائی صاحب کی ان ہی چند سطروں پر تعلیق کے طور پر یہ معروضات پیش کی جارہی ہیں، اس میں گزشتہ سال کے سفر حج کے کچھ سفر پارے بھی ہیں اور عربی زبان میں بات چیت کرنے کے تجربات بھی۔

ہندوستان کے عام علماء کی عربی گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول میں اس کو رواج نہیں دیتے اور عمر بھر پڑھنے پڑھانے کے بعد بھی جب عربی میں گفتگو کی بحث آتی ہے تو ''**ھٰذا شیٌٔ دیگرٌ**'' کہہ دیتے ہیں، ورنہ ان ہی عالموں میں جن کو تھوڑا بہت سابقہ پڑجاتا ہے، وہ چند ہی دنوں میں اس پر قادر ہوجاتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت بے تکلفی سے عربی میں بات چیت کرتے ہیں۔

راقم کو نہ عربیت کا دعویٰ ہے، نہ عربی دانی کا زعم ہے اور نہ ہی عربی زبان میں زیادہ گفتگو کرنے کا سابقہ ہی پڑا ہے، مگر بمبئی میں رہ کر مختلف عرب ممالک کے علماء، ادباء، قراء، اربابِ حکومت، اہلِ دُول اور تجار وعوام کے ساتھ بسا اوقات عربی میں گفتگو کرنے کا سابقہ پڑا، ابتداء میں جھجک اور جھینپ محسوس ہوتی تھی اور میں نیک صورت بن کر **نعم** کہہ دیا کرتا تھا، مگر آخر کب تک یہ بات باقی رہتی، علمی، سیاسی، تاریخی ہر قسم کی باتیں نکلتی تھیں، اور ان میں حصہ لینا پڑتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ''کام چلاؤ'' عربی گفتگو پر قدرت ہوگئی، اور الٹے سیدھے بحث ومباحثہ میں حصہ لینا شروع کردیا

جس کی وجہ سے جھجھک ختم ہوگئی اور زبان بہر حال چلنے لگی۔

پہلی بار ۱۳۸۷ھ میں حج وزیارت کی دولت نصیب ہوئی تھی، اس زمانہ میں بھی علمی اور دینی طبقہ سے بات چیت میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی، اور ہر جگہ کام چلتا رہا، اور گذشتہ سال ۱۳۸۵ھ میں حاضری ہوئی تو گویا کوئی بات ہی نہیں تھی، جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کہیں بھی کسی حلقہ میں ایسا نہیں ہوا کہ گفتگو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموشی رہی ہو، یہ دوسری بات ہے کہ برمحل اور برجستہ گفتگو میں عربیت کے ابرو پربَل آجاتا رہا ہو، اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ اب کے بار عزیزم خالد کمال سلمہٗ متعلم جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعارف و تعلق اور ''رجال السند والہند'' کے مطالعہ کی وجہ سے اکثر مشائخ اور علماء پہلے ہی سے یاد فرماتے تھے اور ملنے کے خواہشمند تھے، ان سے زیادہ راقم اپنے ان نادیدہ بزرگوں اور حسن ظن رکھنے والے ارباب صفا سے نیاز حاصل کرنے کی تیاری کر کے گیا تھا، نیز راقم کا ایک مقالہ عربی زبان میں ''من النارجیل إلی النخیل'' حکومت ہند کے عربی سہ ماہی مجلّہ ''ثقافة الهند''میں تین قسطوں میں چھپ چکا تھا جس کی زائد کا پیاں جدہ کے ہندوستانی سفارت خانہ کے آفیسروں نے طلب کر کے سعودی عرب کے صحافیوں، ادیبوں اور عالموں کو پیش کیا تھا، اس مقالہ میں عرب اور ہندوستان کے ابتدائی اسلامی تعلقات کو جغرافیہ، رحلات اور تاریخ کی کتابوں سے بیان کیا گیا تھا، یہ مقالہ سعودی عرب کے علمی اور تحقیقی حلقہ میں بہت زیادہ پسند کیا گیا، بلکہ سعودی عرب کے سب سے مشہور اور قدیم صحافی ومؤرخ الاستاذ عبدالقدوس الانصاری نے پورا مقالہ چار قسطوں میں اپنے مجلّہ ''المنہل'' جدہ میں نہ صرف شائع کیا بلکہ اس پر جگہ جگہ تعلیقات لکھیں، نیز ہندوستانی سفیر محترم کامل قدوائی صاحب، فرسٹ سیکریٹری محترم سید شہاب الدین صاحب، محترم مولانا خالد صاحب اور عزیز گرامی فضل الرحمٰن صاحب نے وہاں کے ادیبوں اور صحافیوں سے تذکرہ کیا کہ اس سال فلاں آدمی آرہا ہے، وہ سب حضرات

ملاقات کے خواہش مند تھے، راقم کو ہندوستان ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ سفارت خانہ کے ارکان اس مقالہ کی وجہ سے، نیز عزیزم خالد کمال سے تعلق و تعارف کی وجہ سے میری حاضری کے منتظر ہیں، ان باتوں کی وجہ سے راقم کو ضغطہ اور احساس کمتری کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے تشکر و امتنان کی فضا میں ادھر بھی امنگ اور خواہش تھی کہ اب کے حجاز مقدس کے علماء، مشائخ اور ارباب علم سے کھل کر تبادلۂ خیالات کرنا چاہیے، چنانچہ اس انشراح و انشباط نے اور بھی ہمت افزائی کی، اور جدہ اترتے ہی اس کا سلسلہ شروع ہو گیا، میں ابھی کسٹم ہاؤس کے باہر ہی تھا کہ جناب خالد صاحب ملے اور انداز سے پہچان کر نام دریافت کیا میں نے بتایا تو بڑی محبت سے لپٹ گئے اور انتظار کا تذکرہ کیا، اتنے میں کامل قدوائی صاحب تشریف لائے اور تعارف ہوتے ہی پان پیش فرمایا، اور نہایت حسن خلق سے ملے، ادھر خالد صاحب نے محترم سید شہاب الدین صاحب سے جا کر کہا کہ میں ایک خاص آدمی سے مل کر آیا ہوں انھوں نے جھٹ میرا نام لے کر پوچھا کہ فلاں صاحب ہونگے، پھر وہ بھی فوراً تشریف لائے، اور بڑی محبت سے ملے، تقریباً ان سب حضرات نے ''من النار جیل الی النخیل'' والے مقالے کا تذکرہ کیا، اور یہ کہ یہاں کے اہل علم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، یہ باتیں بالکل ہنگامی تھیں، رات بھر جدہ میں رہکر کل مکہ مکرمہ جانا تھا، پھر خالد کمال کی والدہ کی وجہ سے ایک گونہ پابندی بھی تھی، وہ بھی ایک دو دن پہلے مدینہ منورہ سے جدہ آ گئے تھے۔

چونکہ آخری جہاز مظفری سے روانگی ہوئی تھی اور ایام حج قریب تھے، اس لئے اصل کام میں مصروفیت رہی جس کیلئے حاضری ہوئی تھی، اس درمیان میں مختلف ممالک کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، عزیزم خالد کمال حج کے بعد دس بارہ روز تک ساتھ رہے، ان کے ہمراہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے دفتر میں آتا جاتا رہا، نیز شیخ سید علوی مالکی اور دوسرے مشائخ سے ملاقات ہوتی رہی، ان کے

مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد قیام مکہ مکرمہ کے زمانہ میں بارہا ''رابطۃ العالم الاسلامی'' میں حاضری ہوئی، تنہا بھی اور بعض دوسرے ہندوستانی احباب کے ساتھ بھی، عام طور سے مجلّہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے ایڈیٹر شیخ محمد سعید العامودی اور ان کے دفتر کے دوسرے عملہ سے بات چیت رہا کرتی تھی، رُخ سیاسی اور ملکی ہوا کرتا تھا، اکثر دیگر ممالک سے آئے ہوئے صحافی اور اہل علم بھی رہا کرتے تھے اور سیاسیات پر بحث چھڑ جاتی تھی، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بات میں تیزی آجاتی، راقم کھل کر پورے طور سے ان مباحث میں حصہ لیتا تھا، اور آخر میں ٹیپ کا بند یہ ہوتا کہ یہ باتیں ذاتی اور شخصی ہیں ، جب بھی شیخ محمد سعید عامودی کی مجلس سے چلا تو موصوف نے فرمایا کہ پھر کب آئیں گے؟ ہم پھر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ راقم کو بھی جب موقع ملتا پہونچ جاتا، اس مدت میں وہاں کے کئی حضرات سے اچھی خاصی اُنسیت پیدا ہوگئی تھی، رابطہ کے دفتر میں ہندوستان کے بعض حضرات کی ترجمانی بھی کی اور فیجی مسلم لیگ کے سکریٹری جناب بہادر علی صاحب کو ساتھ لے جاکر رابطہ کی طرف سے فیجی میں اسلام اور مسلمانوں کی ضرورت کیلئے ہر قسم کے تعاون کی بات چیت کرائی، اس مدت میں متعدد بار شیخ سید علوی مالکی کے مکان (قرارہ میں) حاضری ہوئی تھی، وہ مکہ مکرمہ کے نہایت ذی علم حضرات میں سے ہیں۔ اور ہر وقت باغ و بہار رہتے ہیں، پہلے سفرِ حج میں بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی، اب کے بار تو نہایت گہری ملاقاتیں رہیں، آخر میں مدینہ منورہ روانگی کے وقت ملاقات نہ ہوسکی، جس کی شکایت ان کے صاحبزادے نے مدینہ منورہ میں خالد کمال سے کی کہ والد محترم ان کا انتظار کررہے تھے اور تصانیف ہدیہ دینے کیلئے رکھا تھا، نیز مکہ مکرمہ میں مکتبہ الحرم میں جانا ہوا تھا، جب مکتبہ الحرم پہونچا تو اس کے مدیر و شیخ سے بات چیت ہونے لگی موضوع ہندوستان کی وہ علمی و تاریخی کتابیں تھیں جو عہد قدیم سے لے کر آج تک حرمین شریفین کی تاریخ پر لکھی گئیں ہیں، احقر نے بتایا کہ فلاں تاریخیں ہندوستانی علماء کی مطبوعہ ہیں اور فلاں فلاں غیر مطبوعہ ہیں، جن میں

سے بعض کا قلمی نسخہ ہمارے پاس ابتک محفوظ ہے، انھوں نے اس گفتگو کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ یہ باتیں عام ہونی چاہئیں، پھر انھوں نے ایک عربی روزنامہ کے مدیر کو فون کیا کہ فلاں کو میں روانہ کرتا ہوں آپ ان سے انٹریو لے کر کل کے اخبار میں شائع کر دیں، مگر اتفاق سے ایڈیٹر صاحب موجود نہیں تھے، اور انھوں نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے عصر کے بعد بلایا کہ میں آپ کے ساتھ اپنا آدمی کر دوں گا، آپ یہ باتیں ایڈیٹر سے کرلیں تا کہ ان معلومات سے یہاں کے اہل علم بھی واقف ہوں، میں ان کے وعدہ پر گیا مگر وہ اتفاق سے اس وقت نہیں مل سکے، پھر نہیں جا سکا، حالانکہ اس کیلئے بہت سے حضرات کوشش کرتے ہیں کہ عربی اخبارات میں ان کا انٹریو اور بیان آجائے۔ مدرسہ صولتیہ میں بار بار حاضری ہوتی تھی جہاں ہندوستانی اور عرب علماء سب ہی ہوتے تھے، مولانا محمد سلیم صاحب اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد شمیم صاحب بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔

۸ رمحرم ۱۳۸۶ھ کو مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی اور ایک ماہ تک یہاں قیام کی سعادت نصیب ہوئی، مدینہ منورہ گویا گھر تھا، ہر وقت جامعہ کے ہندوستانی پاکستانی طلباء، وہاں کے اہل علم اور مشائخ سے ملاقاتیں کتب خانہ شیخ الاسلام میں حاضری نماز اور صلوٰۃ وسلام کے بعد کے مشاغل تھے، عزیزم خالد کمال سلمہٗ نے مدینہ منورہ کے ہر دینی و علمی حلقہ میں تعلق پیدا کر رکھا ہے، اور ہر کوچہ وگلی کے حضرات ان سے آشنا و مانوس ہیں اس لئے شہر کے بہت سے اہل علم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں، ۴ رمحرم کو الشیخ محمد بن ابراہیم العبودی امین عام جامعہ اسلامیہ نے رات کو کھانے پر بلایا، جہاں الشیخ عمر افریقی اور دوسرے بعض مشائخ بھی مدعو تھے، کھانے کے بعد تین گھنٹہ تک مجلس جمی رہی اور مختلف علمی ودینی موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی، یہ محفل بہت ہی دلچسپ اور علمی و معلوماتی تھی، شیخ عبودی نے دریافت فرمایا کہ آپ نے یہ عربی کہاں سیکھی ہے؟ میں نے کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان اور اسلامی علوم بڑے اہتمام

سے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہاں باہمی گفتگو کا موقع نہیں ملتا اس لئے وہاں کے علماء آپ لوگوں کے سامنے گونگے بہرے بنے رہتے ہیں، اور آپ حضرات خیال کرتے ہیں کہ یہ بولی سے ناواقف مذہبی علماء ہیں، بات یہ ہے کہ میں نے بمبئی میں عربوں سے ملنے جلنے کیوجہ سے تھوڑا بہت عربی بولنا سیکھ لیا ہے، جس کی وجہ افہام وتفہیم میں دقت نہیں ہوتی، ۱۷ر محرم کو استاذ شیخ عمر افریقی مساعد امین عام جامعہ اسلامیہ نے عشاء کے بعد کھانے کی دعوت دی، ان کے یہاں افریقہ اور سوڈان وغیرہ کے دو تین علماء تھے، یہاں دو گھنٹہ سے زائد مجلس رہی اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں، ان حضرات کی مجلس میں کھل کر نہایت بے تکلفی سے دوستانہ انداز میں گفتگو رہی، ۱۶ر محرم کو جمعہ کی نماز کے بعد حضرت الشیخ عبدالعزیز بن باز نائب الرئیس جامعہ اسلامیہ نے کھانے پر بلایا، یہاں بھی گھنٹوں گفتگو رہی، شیخ نے یہاں کے علماء کا علمی اور دینی حال دریافت کیا، سلسلۂ کلام میں بعض تاریخی مباحث پر گفتگو نکلی اور بعض کتابوں کے بارے میں بات چیت رہی، شیخ ابن باز پوری مملکت میں بڑے معزز ومحترم مانے جاتے ہیں اور بڑے باوقار ہیں، مگر نجی مجلسوں میں بے تکلف نظر آتے ہیں، یہاں بھی شیخ عبودی اور کئی مشائخ شریک تھے، محترم الشیخ سید محمود الطرازی مدنی سے پرانی ملاقات تھی، ایک دن ان کے یہاں ناشتہ کی دعوت رہی، ہندوستان کے طلباء نے بڑے ذوق وشوق اور اخلاص سے دعوتیں کیں، عزیزان مولوی امیر احمد صاحب رامپوری، مولوی ہلال احمد مبارکپوری، مولوی نعمان صاحب بہاری، مولوی جمیل احمد صاحب بہاری، مولوی سعود صاحب، شیخ سعد الدین صاحب ملیباری، استاذ جامعہ اسلامیہ وغیرہ نے کھانے، ناشتے اور چائے کی دعوتیں کیں، جامعہ اسلامیہ میں شیخ عبدالقادر سیبۃ الحمد کے درس میں شرکت رہی، بعد میں تقریباً روزانہ ہی ان سے مسجد نبوی میں مختلف موضوعات پر گفتگو رہا کرتی تھی، ان مواقع پر اکثر جامعہ کے ہندستانی اور پاکستانی طلباء بھی رہا کرتے تھے، اخوان المسلمین کے کئی

سرگرم حضرات سے اکثر گھنٹوں گھنٹوں مسجد نبوی میں اخوان اور حکومت مصر کے موضوع پر بات چیت ہوا کرتی تھی، میں جامعہ اسلامیہ کے کتب خانہ میں ایک روز بیٹھا ہوا تھا، کئی اساتذہ بھی تھے، ایک عرب استاذ نے باتوں باتوں میں فقہی مسلک کے متعلق کہہ دیا کہ احناف حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتے ہیں اس پر راقم نے جم کران سے گفتگو کی اور کہا کہ میں حنفی ہوں کوئی ایک مسئلہ ایسا بتایئے کہ جن میں میں حدیث کے مقابلہ میں رائے پر عمل کرتا ہوں، یہ گفتگو مناظرانہ انداز کی تھی، دوسرے اساتذہ خاموش مسکرا رہے تھے، اور دونوں کی گفتگوئیں سن رہے تھے، اسی طرح ایک ملیباری صاحب جو جامعہ میں کسی شعبہ سے متعلق ہیں، ان سے میں نے کہا کہ آپ عربی یا ملیباری زبان جانتے ہیں، افسوس کہ آپ ہندستانی ہیں مگر اردو نہیں جانتے، اس پر انھوں نے کہا کہ ہم کو اردو زبان کی ضرورت ہی نہیں ہے، دینی زبان عربی ہے، دنیاوی زبان ملیباری ہے، اردو کی ضرورت ہی کیا ہے، اس وقت موقع نہیں تھا میں خاموش رہا، مگر کتب خانہ میں جب وہ ملے تو پھر ان سے کھل کر بات چیت ہوئی، اور ان کو اپنی اس بات کے بے تکے پن کا احساس ہوا، مسجد نبوی میں ایک روز مغرب بعد حسب معمول تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا، میں بھی پاس ہی الگ بیٹھا ہوا تھا، ایک مولوی صاحب ایک عرب طالب علم کو لیکر آئے کہ یہ کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں، آپ ان کو سمجھا بتا دیں، میں نے اس کو بٹھایا اور کہا کہ پوچھو کیا پوچھتے ہو، اس عزیز نے انسان کے چاند پر جانے کے بارے میں قرآن وحدیث کی رو سے سوالات کئے، میں نے اسے سمجھانا شروع کیا تو اور لوگ بھی ہندستانی پاکستانی اور عرب حضرات آ گئے میں نے اپنی وقتی یادداشت کے مطابق اسے قدیم وجدید انداز میں سمجھایا، آخر میں وہ میرا شکریہ ادا کرتا ہوا یہ کہکر اٹھا کہ اب اس بارے میں میرے شبہات دور ہو گئے۔ دوسرے حضرات بھی اس بحث سے محظوظ ہوئے اور انشراح کا اظہار کیا۔

مولانا سعد الدین صاحب ملیباری استاذ جامعہ اور بعض دوسرے حضرات کی

رائے ہوئی کہ میں جامعہ کے طلبہ کے سامنے ہندستان اور عرب کے علمی تعلقات پر کوئی مقالہ پڑھوں یا تقریر کروں، میں اس کے لئے تیار بھی ہو گیا، مگر معلوم ہوا کہ دو ایک دن میں جامعہ کی چھٹی ہونے والی ہے تا کہ طلباء اختبار کی تیاری کریں لہٰذا اگر ایسا ہوتا ہے تو کل پرسوں تک ہو جانا چاہئے کیوں کہ وقت نہیں ہے، اس صورت کی وجہ سے میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر کوئی چیز پیش کی جائے تو ہر اعتبار سے معیاری ہونی چاہئے، یہ نہیں کہ جیسے تیسے ایک مقالہ تیار کر کے سنا دیا جائے، میں سفر میں ہوں مراجعت کے لئے کتابیں نہیں ہیں پھر جلدی میں مقالہ کی تیاری کچھ یوں ہی سہی ہوگی اور اصل موضوع کئی پہلو سے تشنہ رہ جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ خیال ہی ترک کر دیا جائے، کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ اس قسم کے مقالات کے لئے اچھے اچھے اہل علم وتحقیق مہینوں پہلے سے تیاری کرتے ہیں، معلومات جمع کرتے ہیں، اور الفاظ وعبارت میں تراش خراش کرتے ہیں، تب جا کر ایک معیاری مقالہ تیار ہوتا ہے (چاہے وہ بعد میں ظاہر کریں کہ یہ مقالہ بہت عجلت میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ اس کا رواج بھی ہے) ایسی حالت میں الٹا سیدھا مقالہ تیار کر کے پیش کر دینا نہ جامعہ کے طلباء کے لئے مفید ہوگا اور نہ اپنے لئے بہتر ہوگا۔ چنانچہ یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس میں اپنی کوئی ہتک نہیں محسوس کی اور نہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوا، کتب خانہ شیخ الاسلام میں تقریباً روزانہ حاضری ہوتی اور مخطوطات ونوادرات سے استفادہ کا موقع ملتا، وہاں مختلف بلاد ومصار کے اور خود مدینہ منورہ کے اہل علم وتحقیق آتے جاتے، ان سے ان کے خصوصی فن اور موضوع پر بات چیت ہوتی، تقریباً روزانہ ہی یہاں کسی نہ کسی نئے صاحب علم سے ملنے کا موقع ملتا۔ ان کے علاوہ مدینہ منورہ میں کئی اہل علم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور علمی گفتگو کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ایک مرتبہ ہندو پاکستان کے چند طلبہ مسجد نبوی میں کہنے لگے کہ ہمارے یہاں کے علماء جب یہاں آتے ہیں اور ہمارے جامعہ کے شیوخ واساتذہ سے ملتے ہیں تو

عربی گفتگو پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے تبرک بن کر رہ جاتے ہیں، نہ وہ شیوخ واساتذہ سے تبادلۂ خیال کر پاتے ہیں اور نہ وہ ہمارے علماء سے زیادہ گفتگو کر سکتے ہیں، بلکہ جانبین ایک دوسرے کی برکت حاصل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، صرف مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا ابو الحسن صاحب ندوی اور مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی ان حضرات سے کھل کر ملتے جلتے ہیں اور ہر موضوع پر نہایت واضح انداز میں معاصرانہ گفتگو کرتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ اس سال آپ یہاں کے اہل علم سے کھل کر ہر موضوع پر بات چیت کرتے ہیں، اور ہر قسم کی بحث اور موضوع میں حصہ لیتے ہیں، پھر اس گفتگو میں مرعوبیت اور جھجھک نہیں ہوتی اور یہاں کے اہلِ علم کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان و پاکستان کے اہل علم بھی علم اور مطالعہ رکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے یہاں بھی معلومات ہوتی ہیں، اور ان کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے جس کے لئے وہ دلائل رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ ہندستانی سفارت خانہ کے عملہ میں محترم سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سکریٹری نے بغیر کسی سابقہ ملاقات یا تعارف کے اور بغیر کسی مقصد کے صرف اخلاص اور محبت کی وجہ سے میری بہت زیادہ آؤ بھگت کی، وہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بار بار ان سے ملاقات رہی۔ اور جب انھوں نے ایک پر تکلف دعوت کی اور مدینہ منورہ کے اعیان حکومت اور اعیان شہر کو بلایا تو راقم کو بھی خاص طور سے دعوت دی، جہاں بہت سے حضرات سے ملاقات اور دیر تک مجلس رہی۔ قیام کے مدینہ منورہ کے دوران میں مولانا انعام کریم صاحب مدرسہ شرعیہ کی خدمت میں بار بار حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ وہ بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے رہے، یہیں پر بخاری شریف کے اس نسخہ کو دیکھا جس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے پڑھا تھا اور جگہ جگہ تھوڑے تھوڑے حواشی لکھے تھے، جنۃ البقیع کے قریب رباط مجددیہ میں بھی جانا ہوا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلسلہ کے بزرگوں کی ہے، اس میں

حضرت مظہر جان جاناں وغیرہ کے ملفوظات ومکاتیب کے نادر قلمی نسخے دیکھنے میں آئے۔ نیز ایک قرآن شریف دیکھا جو اسی سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے، اور اساتذہ وشیوخ سے گفتگو کے درمیان کہیں کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کرلیا، اور یہ بات بھی ان شیوخ واساتذہ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی، اگر دل ودماغ میں معلومات ہوں تو زبان کسی نہ کسی طرح ان کو ادا کرہی دیتی ہے، اور سننے والے اس کی قدر کرتے ہیں طرز ادا پر نہیں جاتے کیوں کہ مادری زبان کے مقابلہ میں کوئی زبان مافی الضمیر کے ادا کرنے پر کماحقہٗ قادر نہیں ہوسکتی۔

واپسی کے موقع پر جدہ میں راقم کے اعزاز میں ۳؍جون ۶۶ء کو محترم سید شہاب الدین صاحب نے ایک پرتکلف اور شاندار دعوت اپنی قیام گاہ پر دی، جس میں جدہ اور مکہ مکرمہ کے اکثر صحافی، مدیران جرائد ومجلّات اور ادباء ومصنفین تھے، ان میں شیخ حسین سراج امین رابطہ عالم اسلامی، الاستاذ عبدالقدوس انصاری مدیر مجلّہ ''المنھل''، شیخ محمد احمد جمال مشہور انشاء پرداز ومصنف، شیخ محمد حسین مدیر جریدہ عکاظ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ایک دن پہلے ہی عربی اخبارات میں اس دعوت کا اور اس میں شرکاء کا اعلان آگیا تھا، عرب کے ان صحافیوں اور ادیبوں کی راقم سے دلچسپی کی بڑی وجہ مقالہ ''من النارجیل الی النخیل'' تھا جسے انھوں نے ''ثقافۃ الہند'' دہلی اور ''المنہل'' جدہ میں پڑھا تھا، مجھے جہاز سے اترتے ہی جدہ میں معلوم ہو چکا تھا کہ استاذ عبد القدوس انصاری میری ملاقات کے بیحد شائق ہیں اور بڑی شدت سے انتظار کررہے ہیں، مگر چونکہ حج کا زمانہ تھا اور مصروفیات غیر معمولی تھیں، اس لئے ان سے اسی دن ملاقات ہوئی، وہ نہایت پرتپاک طریقہ سے پیش آئے، مختلف موضوعات پر ہماری ان کی گفتگو ہوتی رہی، خاص طور سے عرب اور ہندستان کے علمی، دینی تعلقات اور

ہندستان کے رجال اشخاص پر جو عرب میں گذرے ہیں، انھوں نے بیحد اصرار کیا کہ آپ دو تین ماہ کے لئے رک جائیں، ہم تمام انتظام کر دیں گے اور آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، مگر چونکہ خالد کمال کی والدہ ساتھ تھیں اس لئے ایسا نہ ہوسکا، انھوں نے اصرار کیا کہ آپ کی جس قدر تصنیفات ہیں عربی یا اردو میں سب کی سب میرے پاس خالد کمال کے ذریعہ بھجوائیں، میں اپنی تصنیفات اور ''المنھل'' پیش کروں گا۔ چنانچہ راقم کی تمام کتابیں خالد کمال کے ذریعہ پہونچ گئیں، استاذ محمد احمد جمال غزوات نبوی کے سلسلے کے مصنف ہیں، وہ اس بارے میں مؤثر اسلوب نگارش رکھتے ہیں، ان کے مقالات و مضامین سے پہلے سے واقف تھا، قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ان کی بعض تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا، ان سے اسی موضوع پر گفتگو رہی، شیخ حسین سراج امین عام رابطہ عالم اسلامی چونکہ عالم اسلام کے ایک اہم ادارہ کے ذمہ دار ہیں، اس لئے میں نے ان سے کہا کہ آپ حضرات ایک طرف عالم اسلام کے ربط و تعلق کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے جان و مال کی بازی لگادی ہے جو فی نفسہٖ نہایت مفید اور ضروری کام ہے، مگر دوسری طرف حال یہ ہے کہ حرم محترم میں ہندوستان پاکستان کے بعض اہلحدیث علماء اُردو میں نہایت اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہیں، مقلدین خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت برے الفاظ استعمال کرتے ہیں ان کے ائمہ کو نازیبا اور دلآزار لہجہ میں یاد کرتے ہیں، اور ہر تقریر میں تنگ نظری اور تنگ دلی کا مظاہرہ کر کے نہایت گستاخانہ انداز میں سبّ و شتم تک کا انداز اختیار کرتے ہیں، جسے ہندوستان کے مرنجان مرنج اہل علم بھی سن کر شدید کوفت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ، مولانا سید عبد الوہاب صاحب بخاری مدراسی اور افضل العلماء مولانا عبدالباری مدراسی اور دیگر علماء ان کی تقریروں کو سن سن کر سخت کوفت محسوس کرتے ہیں۔ آپ عالم اسلام کے ربط واتحاد کے داعی ہیں اور دوسری طرف ہندوستان و پاکستان کے ان تنگ نظر اور مفاد

پرست مولویوں کو مسلمانان عالم کے مرکز میں ان کو برا بھلا کہنے اور ان کے خلاف نفرت پھیلانے کی اجازت دیتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو اپنے کو حکومت اور شیوخ کی نظر میں اچھا ثابت کرنا چاہتے ہیں، کوئی اقامہ چاہتا ہے، کوئی تابعیہ کے چکر میں ہے، کوئی کسی ادارہ میں ملازمت کے حصول کیلئے سرگرداں ہے اور ان کی حرکتوں کو ذمہ دار حضرات ہرگز پسند نہیں کرتے، چنانچہ خود نجد و ریاض کے علماء اہلحدیث اس حرکت کو ناپسند کرتے ہیں، حرم محترم مقلد اور غیر مقلد کا اکھاڑہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس طرح کسی مسلک کے خلاف نفرت وحقارت کا مظاہرہ ہونا چاہئے، یہ مسلمانان عالم کو خدا کے گھر میں پاکر برا بھلا کہنا ہوا، ہمارے ان تأثرات کو شیخ حسین سراج نے سن کر فرمایا کہ فلاں شیخ سے آپ نے اس کا تذکرہ کیا یا نہیں؟ اس کے بعد بات کا رخ پھیرتے ہوئے کہا کہ چونکہ میری والدہ سندھ کے قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتی تھیں، اور ہندوستان وعرب آپ کا خاص موضوع ہے اس لئے قبیلہ کے بارے میں مجھے معلومات دیں کہ تاریخ میں ان کے کن کن افراد کا تذکرہ ملتا ہے، اس دعوت میں ایک پُر لطف بات یہ رہی کہ مغربی طرز پر کھانے کا انتظام تھا، مگر راقم نے بھرے مجمع میں کہا کہ میں تو اسلامی تعلیم کے مطابق کھانا کھاؤں گا یہ کہہ کر پلیٹ میں کھانا لیا اور دوسرے کمرے کی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا شروع کیا، اس کے بعد تمام حاضرین نے ایسے ہی کھایا، کھانے کی پوری مدت تقریباً اسلامی دسترخوان ہی موضوع سخن بنا رہا، بعد میں یہ مجلس دو گھنٹے سے زائد تک رہی، اور مختلف سیاسی، ملکی اور علمی وتاریخی موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

دعوتوں کے سلسلے میں جدہ کی ایک دعوت کا ذکر ضروری ہے، ہمارے بمبئی کے پرانے دوست جناب الحاج عبدالرحیم صاحب انصاری کئی سال سے جدہ میں مقیم ہیں اور وہاں کے ہندوستان و پاکستان کے لوگوں میں کافی مقبول ومحبوب ہیں، وہ اردو شعر وادب سے اچھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایام حج میں ملتے رہے، جب جدہ پہونچا تو

انھوں نے دوستوں سے تعارف اور ملاقات کیلئے ایک خاص دعوت کاانتظام کیا جو جناب محترم محمد احمد صاحب (لکھنؤ) کے دولت کدہ پر رکھی گئی تھی، اس پر تکلف دعوت میں ان کے حلقۂ احباب کے تمام ادب نواز شعراء وادباء شریک تھے، عشاء کے بعد کھانا کھایا گیا پھر بارہ بجے رات تک شعروادب کی نہایت لطیف وسنجیدہ محفل رہی۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد نہ اپنی علمیت وقابلیت دکھانا مقصود ہے اور نہ اپنی عربیت اور عربی دانی کا اشتہار دینا ہے، راقم نے جولکھا پڑھا تھا بمبئی کے تجارتی اور ہنگامی شہر میں اس کا باقی رکھنا مشکل ہے، پھر بھی الحمدللہ کہ لکھنے پڑھنے کا سلسلہ تاہنوز باقی ہے، یہاں بتانا یہ ہے کہ ہمارے علماء مدارس کی فضا میں وہی پرانی عربی استعمال کرتے رہیں تو ان کو اچھا خاصا ملکہ ہوجائے اور عرب ممالک میں یا عرب علماء سے بات چیت اور تبادلہ خیالات میں کوئی دقت اور الجھن نہ ہو، اگر راقم یہاں تھوڑی بہت عربی کلام پر قدرت نہ رکھتا تو شرم اور جھجھک کی وجہ سے ہر عالم اور ہر محفل سے جی چراتا، اور مختلف قسم کے وجوہ تلاش کر کے اپنے کو تسلی دے لیتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے علم اور ذات پر اعتماد کرے، اور ہر موضوع پر اپنے فی الجملہ تیار پائے، ہمارے علماء علوم ومعلومات میں دوسرے ممالک کے علماء سے کم نہیں ہیں، مگر صرف عربی میں تھوڑی بہت قدرت نہ ہونے کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں، اِدھر پچھلے چند سالوں سے یہ خاموشی ٹوٹ رہی ہے، مگر اس میں تیزی کی ضرورت ہے، ہمارے مدارس عربیہ کے اساتذہ کو چاہئے کہ وہ اپنے طلبا سے عربی ہی میں گفتگو کریں، پہلے تو استاذ شاگرد دونوں ہی ضیق محسوس کریں گے، مگر چند دنوں کے بعد بے تکلف فصیح وبلیغ عربی بولنے لگیں گے، جسے عرب علماء سن کر محسوس کریں گے کہ ہم ان کے مقابلہ میں غیر صحیح بولتے ہیں۔

دوسرے ممالک میں جانا ہو یا نہ ہو خود اپنے ملک میں رہ کر عربی زبان بولنا، عربی میں خط وکتابت کرنا اور عربی زبان کو اپنی دینی زبان سمجھ کر زندہ رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

قاضی صاحب کے علمی کارناموں کی مکمل فہرست

قاضی ظفر مسعود ابن قاضی اطہر صاحب مبارکپوریؒ

قاضی صاحب نے جو زبردست علمی و تحقیقی کارنامہ انجام دیا اس کو علمی دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی، یہ قاضی صاحب کے علمی و تحقیقی کارناموں کی مکمل اور جامع فہرست ہے اس میں ان کی تمام اُردو اور عربی تصنیفات کے علاوہ جن زبانوں میں دوسروں نے ان کے ترجمے کئے اور جن اداروں نے اپنے طور پر شائع کیا اور جن مخطوطات کی تصحیح و تحقیق کی ان پر تعلیقات لکھیں یا ان کتابوں کے مسودے حوادث کا شکار ہو گئے اور شائع نہ ہو سکے، ہر ایک کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ فہرست اتنی جامع اور مکمل ہے کہ آئندہ قاضی صاحب کے کارناموں پر تحقیق اور ریسرچ کرنے والوں کیلئے بہترین رہنما ثابت ہوگی، یہ فہرست قاضی صاحب کے صاحبزادے عزیزم قاضی ظفر مسعود سلمہٗ نے تمام کتابوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے۔ ہم ان کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (اسیر ادروی)

(۲) عرب و ہند عہدِ رسالت میں (اُردو)

یہ کتاب ۲۰۰ر صفحات پر مشتمل ہے، ۱۹۶۵ء میں اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کو مصر کے ایک مشہور عالم الدکتور عبدالعزیز عزت عبد الجلیل نے عربی میں ترجمہ کیا اور ۱۹۷۳ء میں الہیئۃ المصریہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا، سندھ (پاکستان) کی تنظیم فکر و نظر نے اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا، کراچی کے ایک ادارہ مکتبہ عارفین نے اس کا ایڈیشن شائع کیا۔

(۲) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (اُردو)

یہ کتاب ۳۴۰ رصفحات پر مشتمل ہے اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۷ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عارفین کراچی نے شائع کیا، تنظیم فکرونظر سندھ نے اس کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا، مصر کے دکتور عبدالعزیز عزت نے اس کا عربی میں الحکومات العربیه فی الهند و السند کے نام سے کیا اور اس کو اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے مجلّہ الدراسات العلمیة نے قسط وار شائع کیا، پھر مکتبہ آل یداللہ بکر یہ ریاض نے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔

(۳) اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ (اُردو)

یہ کتاب ۲۴۳ رصفحات پر مشتمل ہے، ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

(۴) خلافتِ راشدہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۲۸۰ رصفحات پر مشتمل ہے ۱۹۷۲ء میں ندوۃ المصنفین دہلی نے اس کو شائع کیا، بعد میں تنظیم فکرونظر سندھ نے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۵) خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۵۵۸ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا، دوبارہ تنظیم فکرونظر سندھ نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔

(۶) خلافتِ بنوامیّہ اور ہندوستان (اُردو)

یہ کتاب ۶۷۱ رصفحات پر مشتمل ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۵ء میں شائع کیا، پھر تنظیم فکرونظر سندھ اپنے یہاں اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔

(۷) دیارِ پورب میں علم اور علماء (اُردو)

یہ کتاب ۴۸۲ر صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مشرقی ہندوستان میں علمی سرگرمیوں کا محققانہ تذکرہ ہے، اس کو بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۸) تذکرہ علماء مبارکپور (اُردو)

کتاب ۱۹۲ر صفحات پر مشتمل ہے، اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۷۴ء میں شائع کیا۔

(۹) مآثر ومعارف (اُردو)

یہ کتاب ۲۷۱ر صفحات پر مشتمل ہے، اس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا، یہ قاضی صاحب کے پچیس مقالات کا مجموعہ ہے ۔

(۱۰) آثار واخبار (اُردو)

یہ کتاب ۱۵۰ر صفحات پر مشتمل ہے، یہ قاضی صاحب کے کچھ مقالات کا مجموعہ ہے، جس کو ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑے اہتمام سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔

(۱۱) تدوینِ سیر ومغازی (اُردو)

یہ کتاب ۳۲۰ر صفحات پر مشتمل ہے، اپنے موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو علم وتحقیق کا شاہکار ہے، اس کو شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔

(۱۲) خیر القرون کی درس گاہیں (اُردو)

کتاب کا پورا نام ''خیر القرون کی درس گاہیں اور ان کا نظام تعلیم وتربیت'' ہے۔ یہ کتاب ۳۹۲ر صفحات پر مشتمل ہے، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۹۵ء میں اسکو شائع کیا۔

(۱۳) ائمہ اربعہ (اُردو)

کتاب ۲۵۵؍صفحات پر مشتمل ہے، جس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۹ء میں اہتمام سے طبع کرا کے شائع کیا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن مکتبہ تنظیم اہل سنت لاہور نے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۴) بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات (اُردو)

یہ کتاب خواتین اسلام کی دینی و علمی خدمات پر روشنی ڈالتی ہے، اس کو بمبئی کے مشہور مکتبہ شرف الدین الکتبی واولادہٗ نے شائع کیا تھا، دوبارہ اس کو دائرہ ملیہ مبارکپور کی طرف سے بھی شائع کیا گیا۔

(۱۵) اسلامی نظام زندگی (اُردو)

یہ کتاب ۲۵۶؍صفحات پر مشتمل ہے، اس کو الحاج عبداللہ سمکری ابن حاجی احمد مکی نے رفاہ عام کیلئے اپنی طرف سے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

(۱۶) افاداتِ حسن بصریؒ (اُردو)

یہ ۵۶؍صفحات کا کتابچہ ہے، جس کو دائرہ ملیہ مبارکپور نے ۱۹۵۰ء میں شائع کیا۔

(۱۷) مسلمان (اُردو)

یہ بھی ایک کتابچہ ہے، جو ۶۴؍صفحات پر مشتمل ہے، جس کو جمعیۃ المسلمین جنجیرہ بمبئی نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا تھا۔

(۱۸) الصالحات (اُردو)

یہ بھی ۶۴؍صفحات کا کتابچہ ہے، جو خاص طور پر خواتین کیلئے لکھا گیا تھا یہ پہلی بار بمبئی سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا دوبارہ انصار ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر اکیڈمی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔

(۱۹) تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۰) اسلامی شادی (اُردو)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو صرف ۳۵ صفحات کا ہے اس کو ۱۹۸۵ء میں مکتبۃ الحق جوگیشوری بمبئی نے شائع کیا تھا دوبارہ شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔

(۲۱) معارف القرآن (اُردو)

یہ ۵۰ صفحات کی کتاب ہے جسکو ایجنسی تاج کمپنی بمبئی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۲) طبقات الحجاج (اُردو)

یہ ۱۹۵ صفحات کی کتاب ہے جس کو انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا۔

(۲۳) علی و حسین (اُردو)

یہ چھوٹے سائز کے ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے ایک کتاب کی تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس کو ۱۹۶۰ء میں مکتبہ دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا۔

(۲۴) حج کے بعد (اُردو)

یہ مختصر سا رسالہ ہے جو ۴۰ صفحات کا ہے، انجمن خدام النبی بمبئی نے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا،

(۲۵) خواتین اِسلام کی علمی و دینی خدمات (اُردو)

یہ کتاب پہلے بنات اسلام کی علمی و دینی خدمات کے نام سے شائع ہو چکی تھی

بعد میں کچھ حک واضافہ کے بعد اس کو شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے شائع کیا۔ کتاب میں مزید معلومات کا اضافہ ہے۔

(۲۶) قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک (اُردو)

یہ قاضی صاحب کی خودنوشت نہایت مختصر آپ بیتی ہے، پہلے اسکو دائرہ ملیہ مبارکپور نے شائع کیا تھا پھر اسکو مکتبہ صوت القرآن دیوبند نے دوسرا ایڈیشن صاف ستھرا شائع کیا اس کے صفحات ۵۶ ہیں۔

(۲۷) مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم وعلماء (اُردو)

کتاب ۲۲۸ر صفحات پر مشتمل ہے، یہ ایک مقالہ تھا جو''البلاغ'' کے تعلیمی نمبر کیلئے لکھا گیا تھا، جسے بعد میں قاضی صاحب نے مزید اضافہ کر کے کتابی شکل دی ،قاضی صاحب کی وفات کے بعد شیخ الہند اکیڈمی دیوبند نے مئی ۱۹۹۸ء میں اسکو شائع کیا۔

(۲۸) رجال السند والہند الی القرن السابع (عربی)

یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو پہلے ۱۹۵۸ء میں ۳۲۸ر صفحات میں محمد احمد میمن برادران بمبئی نے مطبع حجازیہ سے شائع کیا تھا، پھر اس کتاب میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا اور ۱۹۷۸ء میں دارالانصار قاہرہ (مصر) نے دو جلدوں میں ۵۸۸ر صفحات میں شائع کیا، آج وہی ایڈیشن حجاز ومصر اور پاکستان میں دستیاب ہے، پہلا ایڈیشن اب ناپید ہے، اس کتاب کو اہل علم نے بڑی اہمیت دی ہے، یہی کتاب مصر وحجاز میں قاضی صاحب کے تعارف کا باوقار ذریعہ بنی۔

(۲۹) العقد الثمین (عربی)

کتاب کا پورا نام **العقد الثمين في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين** ہے، یہ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی

بمبئی نے ۳۳۵ صفحات میں شائع کیا تھا، دوسری بار یہی کتاب دار الانصار قاہرہ (مصر) سے ۲۳۱ صفحات میں شائع ہوئی۔

(۳۰) الهند في عهد العباسيين (عربی)

یہ کتاب صرف ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے اسکو بھی دارالانصار قاہرہ نے ۱۹۷۹ء میں شائع کیا۔

(۳۱) جواهر الاصول (عربی)

کتاب کا پورا نام جواهر الاصول في علم حديث الرسول ہے۔اس کے مصنف ابو الفيض محمد بن محمد بن علي حنفي فارسي ہیں، یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی، اس کا مخطوطہ قاضی صاحب کو بعض ذرائع سے دستیاب ہوا تو آپ نے اس مخطوطہ کی تصحیح اور تحقیق کی اور بہت مفید تعلیقات لکھیں، اس کا پہلا ایڈیشن شرف الدين الكتبي و اولادہٗ بمبئی نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا جو ۱۲۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن الدار السّلفیہ بمبئی نے شایع کیا، جب یہ کتاب حجاز پہونچی تو اس کا ایک خوبصورت ایڈیشن مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ نے اہتمام سے شائع کیا اور حجاز میں عام کیا۔

(۳۲) تاريخ اسماء الثقات (عربی)

یہ کتاب ابن شاہین بغدادی کی تصنیف ہے اور طبع نہیں ہوئی تھی، اس کا ایک مخطوطہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں تھا جس سے قاضی صاحب نے نقل لی تھی، استاذی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث الاعظمی نے دیکھا تو قاضی صاحب سے مانگ لیا پھر دوبارہ نقل کر کے اس کی تصحیح و تحقیق کی اور اس پر تعلیقات لکھیں۔ ۱۹۸۶ء میں شرف الدین الکتبی واولادہٗ بمبئی نے اس کو شائع کر دیا، یہ کتاب ۲۳۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس کی ابتدا میں قاضی صاحب نے ایک پر مغز مقدمہ لکھا، شاید محدث

اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تحقیق فرمائی ہے اور شاید ابھی تک کتاب طبع نہیں ہوئی ہے۔

(۳۲) دیوان احمد (عربی)

یہ قاضی صاحب کے جد مادری مولانا احمد حسین صاحب رسولپوری کی عربی نظموں کا مجموعہ ہے جس کو مرتب و مدون کر کے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ہے۔

(۳۴) مئے طہور (اُردو) غیر مطبوعہ

قاضی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ جسے مئے طہور کے نام سے مرتب کر کے اس پر مقدمہ لکھ چکے تھے مگر پریس کو نہیں دے سکے۔

اس کے علاوہ ''سیرت رسول خود حضور کی زبانی'' کے عنوان سے مواد جمع کر رہے تھے، اموی خلفاء و امراء اور تدوین حدیث کے موضوع پر بھی معلومات جمع کر رہے تھے، یہ تمام مسودے نامکمل ہیں قاضی صاحب نے قیام لاہور کے زمانہ میں منتخب التفاسیر کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کر کے دانش بکڈپو لاہور کو دی تھی، مذکورہ دونوں کتابیں تقسیم ملک کی نذر ہو گئیں۔

(بشکریہ مجلّہ ''ترجمان الاسلام'' بنارس ''قاضی اطہر نمبر'')

قاضی اطہر صاحب
معاصر اہل علم کے خطوط کے آئینے میں

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ

عربی کا مشہور مقولہ ہے کہ المعاصرۃ اھل المنافرۃ، ہم عصر ہونا باہمی منافرت کی بنیاد ہے، یہ کہاوت تجربہ کی روشنی میں بہت حد تک صحیح ہے، دیکھا یہی جاتا ہے کہ، لوگ اپنے ہم عصر اصحابِ کمال کے اعتراف میں عموماً بخل سے کام لیتے ہیں، ان کی خوبیاں نظر انداز کر دیتے ہیں، بسا اوقات باہمی چشمک اور حسد کا ظہور ہوتا ہے۔لیکن اس مثل سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے تواضع اور سادگی کا جذبۂ فراواں رکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی فطری تواضع کی بنا پر اصحاب کمال بلکہ بے کمالوں کے سامنے بھی جھکے رہتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنے کو اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں، جیسے انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہوا دوسرے کو تمام عظمتیں حاصل ہوں، اور یہ معاملہ از راہ تصنع نہیں ہوتا، انھیں یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں ہوں تو بڑا، لیکن از راہ تواضع خود کو چھوٹا بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ایسا کوئی شائبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا، وہ واقعی دل وجان سے خود کو چھوٹا دوسروں کو بڑا دیکھتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے حق تعالیٰ کے دستور من تواضع للہ رفعہ اللہ کا ظہور ہوتا ہے، کہ جو اللہ کے لئے پستی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

حضرت قاضی اطہر مبارکپوری علیہ الرحمہ ایسی ہی مستثنیٰ شخصیات میں ہیں، آپ کے جتنے بھی مضامین اس نمبر میں اور اس کے علاوہ دوسرے جرائد ومجلّات میں مختلف

اہل علم حضرات کے قلم سے پڑھیں گے، سب قاضی صاحب کی تواضع، کسر نفسی اور سادگی کا ذکر کرتے ہیں، جن لوگوں نے قاضی صاحب کو دیکھا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قاضی صاحب میں دینی غیرت اور خودداری گوکہ بہت تھی، مگران میں کبر ونخوت کا شائبہ نہ تھا۔ بلکہ سچی تواضع اور بے نفسی ان کی طبیعت اور مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی، وہ بہت بڑے تھے، بہت نامور صاحب علم تھے، کثیر التصانیف بزرگ تھے، اعلیٰ درجے کے محقق تھے، اور انھیں معلوم تھا کہ علم وتحقیق میں ان کا پایہ کتنا بلند ہے، مگر جب کسی سے ملتے، تو نہ اپنی کسی بڑائی کا اظہار کرتے، نہ اپنے علم کا دباؤ ڈالتے، ہر شخص سے خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، بے تکلف ملتے، بسا اوقات اسی کی زبان میں بات کرتے، جو انھیں پہلے سے نہ جانتا ہوتا اسے احساس بھی نہ ہوتا کہ وہ علمی دنیا کی ایک عظیم ہستی سے مل رہا ہے۔

قاضی صاحب کی اسی تواضع کا اثر تھا کہ معاصرین کو ان سے حسد کرنے اور ان کا رتبہ گھٹانے کا موقع ہی نہ مل پاتا تھا، قاضی صاحب کے انداز اور ان کے معاملات سے ہر شخص محسوس کرتا کہ، وہ اسے بلند رتبہ دے رہے ہیں، پھر کوئی کس بنا پر نفرت کرے۔ وہ تو محبت کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے، اس سلسلے میں اکابر تو خیر اکابر ہیں، وہ جو چھوٹے ہیں، بہت چھوٹے ہیں، ان کے ساتھ بھی ان کے رتبے اور درجے سے بڑھ کر قاضی صاحب معاملہ فرماتے۔

قاضی صاحب کو معاصرین کس نگاہ سے دیکھتے تھے؟ قاضی صاحب کا رتبہ ان کے نزدیک کیا تھا؟ اس کی کچھ جھلکیاں ان مکاتیب ومراسلات میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو معاصر علماء نے انھیں لکھے ہیں، قاضی صاحب کی عظمت یہاں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے خطوط کا بڑا ذخیرہ نہایت اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، ملک کے بہت سے نامور علماء اور بڑے اصحابِ علم نے یہ خطوط لکھے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ان معاصر علماء کے خطوط کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں۔

محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی علیہ الرحمۃ :۔

ہمارے علم میں ہندوستان کے بڑے علماء میں سب سے قدیم اور مستحکم تعلق محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ تھا۔ قاضی صاحب کے دل میں ان کی بڑی عظمت تھی ، اور مولانا اعظمی بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے ، دونوں حضرات میں ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت کا سلسلہ بلاانقطاع جاری رہتا تھا، میرے پاس حضرت محدث کبیر کے خطوط کا ایک حصہ موجود ہے، یہ ۱۰/ مارچ ۱۹۵۹ء سے ۳/ مارچ ۱۹۸۱ء تک کے مکاتیب ہیں۔ان کی تعداد ۶۸/ ہے ، اللہ جانے ان کے علاوہ اور کتنے خطوط ہوں گے۔ یہ خطوط زیادہ علمی تر کتابوں کی تحقیق وتفتیش ، گھریلو نجی حالات اور سفر وغیرہ سے متعلق ہیں، ان کی سطر سطر سے بے تکلفی ، بے ساختگی ، محبت و تعلق کی گرمی اور باہم مخلصانہ مناسبت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، چند ایک خطوط کے اقتباس یہاں نقل کرتا ہوں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ، حضرت مولانا اعظمی اور قاضی صاحب کو یہ خیال ہوا کہ ایک علمی و تصنیفی اور نشر واشاعت کا ادارہ قائم کیا جائے ، جو علمی و تحقیقی کاموں کا مرکز ہو، اس کیلئے غور وفکر اور باہم مشورے ہوتے رہے۔اس سلسلے میں دو جگہیں زیرِ غور تھیں ، مئو اور بمبئی ، مئو میں حضرت مولانا اعظمی تھے ، بمبئی میں قاضی صاحب رہتے تھے، ایسا ادارہ غالبًا مولانا چاہتے تھے کہ بمبئی میں ہو اور قاضی صاحب چاہتے تھے کہ مئو میں ہو۔قاضی صاحب نے اس کیلئے کوشش بھی کی تھی ، مگر حضرت مولانا اِدھر کے حالات سے مطمئن نہ تھے، چنانچہ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

”مالیگاؤں میں ۱۹/ دن لگ گئے ، اس کے بعد بمبئی آنے کا موقع نہیں معلوم ہوا، نیز بڑا محرک آنے کا یہ خیال تھا کہ آپ سے، یحییٰ زبیر سے بمبئی میں کسی ادارہ کیلئے بات ہوئی ہوگی ، جب معلوم ہوگیا کہ یہ بات نہیں ہے، تو کوئی خاص محرک نہیں رہا، اپنے قرب وجوار میں اب بھی میرا خیال یہی ہے کہ جیسا

ادارہ آپ چاہتے ہیں، قائم ہونا مشکل ہے، اسی طرف (بمبئی میں) ایسے ادارے قائم ہو سکتے ہیں اور چل سکتے ہیں، اِس طرف بخل، حسد اور بے ذوقی نے راستے بند کرر کھے ہیں لیکن اُدھر جو خرابیاں ہیں ان کا انکار بھی ممکن نہیں، آپ دور رہتے ہیں اس لئے قرب مطلوب ہے، مگر مستقل قرب حاصل ہو جائے تو یقین ہے کہ یہاں کے حالات چند ہی دنوں میں بعد کو مرغوب ومطلوب بنادیں گے۔

میں آج کل کھانسی سے بہت پریشان ہوں، آج خصوصیت سے بہت مضمحل ہوں، بہت جبر کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں، میری صحت اتنی کمزور ہے کہ ہمت نہیں پڑتی، اگر چہ شوق بے نہایت ہے۔" ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۰ء

ایک خط میں، جو اکتوبر ۱۹۶۱ء کا لکھا ہوا ہے، چند کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے ذوق ومناسبت کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

"الحمد للہ خیریت ہے، ادھر میرا ایک نواسہ سخت بیمار ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں بہت پریشان تھا، الحمد للہ اب وہ اچھا ہے، **العبر** جب واپس آجائے، عبارت نقل کر کے بھیجئے گا، (۱) اب اعظم گڈھ کیا لکھوں، مجمع البحرین جہاں تک یاد ہے محمد بن علی الطریحی (کٹر شیعہ اثناء عشری) کی تصنیف ہے، ایران میں چھپی ہے، لکھنو میں غالباً میں نے اسے دیکھا تھا، الفاظ آیات واحادیث کی تفسیر تمامتر کتب اہل سنت سے ماخوذ ہے۔

آپ نے جو عبارت لکھی ہے اس میں حلق کا فاعل متعین طور پر معلوم نہیں ، اغلب یہ ہے کہ وہ حدیث مرفوع (فعلی) نہیں ہے، کسی صحابی یا تابعی کا واقعہ ہوگا۔ خیال میں رکھوں گا، کہیں کوئی بات نظر آئی تو لکھوں گا، ....فضائل

---

(۱) **العبر للذہبی** میں جنگ صفین کے ذکر میں بدری صحابہ کی شرکت کا ذکر ہے، غالباً اس کی تعداد بتائی ہے، اسی عبارت کی نقل حضرت مولانا نے طلب کی تھی۔

اعمال انھوں نے مجھے دکھائی تھی............اس کا ترجمہ بڑے کام کا ہوگا۔

حیدرآباد سے مولانا سید فضل اللہ نے سلام لکھنے کو لکھا ہے، وہ اپنی کتاب کا غلط نامہ چھپوار ہے ہیں، مجھ کو بار بار لکھا کہ کوئی خامی ہو تو لکھئے، آج ان کو چند باتوں کی طرف متوجہ کر رہا ہوں۔

آج سنن سعید بن منصور کی تیسری جلد کے تین ورق کا عکس ایک صاحب نے بھیج کر دریافت کیا ہے کہ یہ کون سی کتاب ہے، افسوس ہے کہ بس اتنی ہی مل سکی، یعنی فقط ایک جلد، باقی جلدوں کا ابھی پتہ نہیں چل سکا۔

ایک خط میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

''خط ملا، سب حالات معلوم ہوئے، خوشی ہوئی شیخ عبدالعزیز بن باز کا جواب آ گیا، لکھتے ہیں کہ ۸۱ھ کے لئے داخلہ کی مدت ختم ہوگئی، لیکن خالد کمال (۲) ۸۲ھ کے داخلہ کیلئے اپنی درخواست مع شرائط قبول ومؤہلات سعودی سفیر کے پاس بھیج دیں، اسلئے آپ دوسری درخواست ۸۲ھ کیلئے بھیجد یجئے، اس کے بعد میں دوسرا خط ابن باز کو لکھوں گا۔

مارچ ۱۹۸۱ء کے خط میں محدث کبیر لکھتے ہیں:

''ایک صاحب تاریخ گجرات خوب مفصل لکھوانا چاہتے ہیں، صوبہ کی تاریخ کے ساتھ تاریخی مقامات اور نامور گجراتیوں کا تذکرہ لکھوانا چاہتے ہیں، مواد فراہم کرنے کی ذمہ داری ان کی ہوگی، میری نگاہ آپ پر پڑتی ہے، اگر آپ کی رضامندی معلوم ہو تو میں ان سے معاملہ طے کروں،

میں نے سنا ہے کہ آپ مبارکپور جلد ہی آنے والے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟

خطوط کے ان اقتباسات سے باہمی مناسبت اور بے تکلفی اور مخلصانہ تعلقات کی لطافت کا احساس بخوبی ہوتا ہے۔

(۲) قاضی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا خالد کمال صاحب، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان سے ابتداً گئے تھے۔

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا ابوالوفاء افغانی علیہ الرحمۃ کا شمار اس دور کے محقق اور جید علماء میں تھا، اصلاً افغانی تھے، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد سے فارغ ہوئے، اور پھر وہیں کے ہورہے، **لجنة احياء المعارف النعمانيه** کے نام سے فقہ حنفی کی امہات الکتب کی اشاعت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا، جس سے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد **علیهم الرحمة** کی کتابیں شائع ہوئیں، علم وفضل میں مولانا ابوالوفاء افغانی کا پایہ بہت بلند تھا، ادب وتاریخ اور فقہ وحدیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے، بالخصوص فقہ حنفی کے ساتھ ان کا شغف مثالی تھا، علم کیلئے انھوں نے دنیا کو تج دیا تھا، متعدد بیش قیمت کتابیں ان کی تعلیق وتحقیق سے شائع ہوئیں، جن میں سے اکثر فقہ حنفی سے متعلق نوادرات کی حیثیت رکھتی ہیں، مولانا کے ساتھ قاضی صاحب کے نہایت گہرے اور مخلصانہ روابط وتعلقات تھے۔

مولانا ابوالوفاء صاحب افغانی کا ایک گرامی نامہ قاضی صاحب کے نام ملاحظہ ہو۔ تبرکاً اسے من عن نقل کرتا ہوں۔

از:۔ جلال کوچہ ۴۶۵۔ حیدرآباد دکن، یوم شنبہ ۲۰/رجب ۱۳۹۴ھ

عزیزم قاضی جی! **رفعهٗ الله إلى الدرجة العليا واطال عمرهٗ مع السلامة**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کل آپ کا ہدیہ عالیہ موصول ہوکر موجب مسرت ہوا، **بارک الله فی قلمک وشکر کی مساعیک**۔ آپ نے ماشاءاللہ قوم کی ایسی خدمت کی، جس کو اب تک کسی نے نہیں کیا تھا اور ایسے مضایق سے جواہر پارے نکالے کہ جن کی روشنی سے عالم منور ہوا، یہ خدمت آپ کے مقسوم میں تھی۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر اس پر اللہ جل شانہٗ نے آپ کو ادب سے نوازا ہے، کہ کسی کا نام بغیر احترام کے نہیں لیا، جزاک اللہ خیراً

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا محمد فخر الدین صاحب علیہ الرحمۃ مراد آباد کے رہنے والے تھے، عرصۂ دراز تک مدرسہ شاہی مراد آباد میں شیخ الحدیث رہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ نے اخیر عمر میں دار العلوم دیوبند بلایا تھا۔ حضرت شیخ کے انتقال کے بعد دار العلوم میں کامیاب شیخ الحدیث رہے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب نے بخاری شریف انھیں سے پڑھی تھی۔ قاضی صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے، اور شیخ کو بھی ان سے بہت تعلق تھا۔ ایک مکتوب ان کا ملاحظہ ہو:

''میرا جی چاہتا ہے کہ میں مدینہ منورہ جا کر زیارت رسول ﷺ سے مشرف ہو کر خالد کمال سے بھی ملاقات کروں، سنا ہے کہ وہ مدینہ یونیورسٹی میں ہیں، میری حج کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے، قدوائی صاحب سے کہلوایا ہے، امید ہے کہ منظور ہو جائے گی، آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس بارے میں سعی فرمائیں۔ شعبان ۱۳۸۵ھ''

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمۃ:

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب علیہ الرحمۃ قاضی صاحب کے خاص اساتذہ میں ہیں، جنھوں نے لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کی بہت کچھ رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی ہے، مدرسہ شاہی مرد آباد میں استاذ تھے، اور ایک رسالہ وہیں سے بنام ''قائد'' نکالا کرتے تھے، اس میں قاضی صاحب کے مضامین شائع فرماتے تھے، قاضی صاحب نے ان سے اخیر تک طالب علمانہ تعلق برقرار رکھا۔ قاضی صاحب نے جب بمبئی چھوڑنے کا ارادہ کیا، تو مولانا محمد میاں صاحب کو اس کی اطلاع

دی۔اس پر مولانا لکھتے ہیں:

نامہ عزیز باعثِ مسرت ہوا...... اچھا آپ کا دل بمبئی سے گھبرا گیا، اب کیا ارادہ ہے؟ وطن میں دل لگتا ہے، تو کیا پارچہ بافی کا کارکانہ قائم کریں گے، یا مدرسہ احیاء العلوم میں تعلیمی اور تدریسی خدمت انجام دیں گے؟ اگر ایسا ہے تو بمبئی سے دل گھبرا جانا مبارک ہو، مگر شاید یہ بھی نہ ہو سکے، تو پھر کیا؟

احقر کے ذہن میں آپ کے مناسب چند کام ہیں،

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، بہت بڑا کام ہے، اگر وسائل مہیا ہوں تو حکومت سے اس میں امداد بھی مل سکتی ہے۔

(۲) اگر یہ نہ ہو تو دوسرا کام ہے، تاریخ مذاہب ہند، یہ پہلے کے مقابلے میں آسان ہے،

(۳) تیسرا کام جوان دونوں کے مقابلے میں آسان ہے، تاریخ علماء ومشائخ ہند،

تینوں کاموں کیلئے جاں فشانی اور ہمت مردانہ کی ضرورت ہے

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری:

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے ممتاز شاگرد اور ان کے علوم کے شارح تھے، علم حدیث میں خصوصی کمال انھیں حاصل تھا، عربی زبان وادب پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔

۱۳۹۷ھ میں ان کا وصال ہوا، **معارف السنن** کے نام سے ترمذی شریف کی بہترین شرح لکھی۔ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی المحدث نے لکھا تھا:

اس دور قحط الرجال میں مولانا کا فقدان اتنا بڑا خسارہ ہے کہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ایسا کامل مدتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ، قاضی صاحب کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

تقریباً ایک ماہ کے بعد نامۂ گرامی کا جواب دے رہا ہوں، اس اضطراری تاخیر کے لئے معافی چاہتا ہوں، رجال السند والہند کا شکریہ، ماشاء اللہ خوب زیور طبع سے آراستہ ہوئی، جزاکم اللہ خیراً۔ رجال السند والہند کے سلسلے میں ایک بہت بڑے محقق، جو امام صاغانی کے معاصر ہیں، گزرے ہیں، مسعود بن حسین بن شیبہ ہندی صاحب کتاب التعلیم، جنھوں نے امام ابوحنیفہ کی حمایت میں، امام الحرمین وغزالی کی سخت تردید کی ہے، غالباً اسکو میں نے دیکھا ہوگا، اس وقت مزید کچھ یاد نہیں، تقریظ عند الفرصت لکھ کر ارسال خدمت کردوں گا ان شاء اللہ۔

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

نامۂ گرامی نے ممنون فرمایا، کل ان شاء اللہ معارف السنن خالد صاحب کے یہاں پہونچادی جائے گی، سنن سعید بن منصور کا کام مکمل ہوگیا، الحمدللہ، خوش خبری آپ سے سنی۔

جواهر الاصول للتقی الفاسی المکی کا مجھے بالکل علم نہیں، دیکھ لیجئے کہ اگر فوائد ہوں تو اس پر کام کیجئے، بہرحال یہ فن تو اب بہت غنی ہوگیا، اچھا ذخیرہ مطبوعات میں آگیا ہے۔

آپ کے صاحبزادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاء اللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔ ۲۰؍صفر ۱۳۸۴ھ

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی:

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی مفتی، ولی صفت، پاک فطرت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے صاحبزادے تھے، دین وسیاست دونوں میدانوں

میں صف اول کے لوگوں میں رہے، بڑے مدبر صاحب فراست اور صاحب علم تھے، قاضی صاحب سے خصوصی تعلق تھا، قاضی صاحب کی اردو کی تمام اہم کتابیں انھوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے شائع کیں، اور ہر کتاب میں پیش لفظ کے طور پر بہترین تعارف لکھا۔ ایک خط میں قاضی صاحب کو لکھتے ہیں:

مکرمت نامہ ملا، مضمون گرامی پہونچ گیا تھا، یہاں یہی خیال رہا کہ رسید روانہ کردی گئی ہے، بہرحال معذرت خواہ ہوں، ان شاء اللہ جنوری کے برہان میں مضمون شائع ہوگا، آپ کا مضمون برہان کے معیار پر پورا نہ اترے یہ کیسے ہوسکتا ہے، جماعت میں آپ کا وجود قیمتی ہے، علماء کی شان کے بہت سے جوہر آپ کی ذات میں پنہاں ہیں۔ ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۰ء

حضرت مولانا فضل اللہ صاحب:

بہار کے مشہور بزرگ حضرت مولانا محمد علی مونگیری یکے از بانیان ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پوتے ہیں، بڑے بزرگ صاحب علم اور نیک نفس تھے، امام بخاری کی تصنیف الادب المفرد کی شرح فضل اللہ الصمد کے نام سے لکھی، اس پر قاضی صاحب نے البلاغ میں تبصرہ کیا، تو انھوں نے خط لکھا:

آپ کا مرسلہ البلاغ پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ یقین مانئے کہ آپ نے تبصرہ لکھنے میں دیر کی، اس کا ذرا ملال نہیں، انسان شے کی خوبی کو دیکھتا ہے، نہ یہ کی وہ چیز جلد حاصل ہوئی یا دیر سے۔ حافظ مجیب اللہ نے ایک سال سے زیادہ ہی دیر لگائی، بڑے اچھے الفاظ میرے متعلق اور کتاب کے متعلق لکھے، مگر پھر بھی کتاب کا حق ادا نہیں کیا، ''زندگی'' نے بڑی ہوشیاری برتی، کتاب کے شروع میں جو تعارف کتاب کا ہے، اسکو مختصر کر کے تبصرہ کا نام دے دیا۔

مولانا عبد الماجد دریابادی بڑے لوگوں میں ہیں، مجھ فقیر کو ان کی بارگاہ

میں بار کہاں مل سکتا تھا، آپ نے تمام ہندوستانی جریدوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا ہے۔''

۲۰/اپریل ۱۹۶۳ء۔

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری:

حضرت مولانا عبدالباطن صاحب جون پوری ان خاصان خدا میں تھے، جنھیں دیکھ کر خدا کی یاد دل میں تازہ ہوجاتی ہے، جن کی مجلس میں بیٹھ کر مجلس نبوت کی خنکی حاصل ہوتی ہے، جونپور کے مشہور صاحب کرامت بزرگ، مصلح بنگال حضرت مولانا کرامت علی جون پوری کے پوتے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب جونپوری کے فرزند گرامی ہیں، ایک باران کی خدمت میں اس خاکسار کی حاضری ہوئی ہے، طالب علمی کا دور تھا، نوجوانی کا زمانہ تھا، مگر انھوں نے ایسی خاطر مدارات کی، اور اتنی تواضع وفروتنی کا معاملہ فرمایا کہ حیرت ہوہوگئی، چہرہ اتنا روشن اور نورانی تھا کہ اب تک اس کی تابانی آنکھوں میں محفوظ ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہاں تشریف لے گئے اور وہیں انتقال ہوگیا، اتنا بڑا جنازہ اب تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ اخبارات کی خبر تھی کہ چوبیس لاکھ سے زائد مجمع نے ان کی نماز جنازہ ادا کی تھی، ان کے چھوٹے چھوٹے متعدد رسائل ہیں جو بہت مؤثر اور دلآویز ہیں۔ ایک مکتوب اس بزرگ ہستی کا بھی قاضی صاحب کے ذخیرے میں ملا، برکت کے واسطے اسے نقل کرتا ہوں:

البلاغ کے پرچے آجاتے ہیں، اور آپ سے غائبانہ علمی ملاقات ہوجاتی ہے، مارچ کے البلاغ کے شذرات میں جو مضمون دوسرے صفحہ پر ارقام فرمایا ہے، جس میں ہندوپاک کے اہل علم کی کس مپرسی کا رونا رویا گیا ہے، وہ ہو بہو میرے حسب حال ہے، کتاب ''واقعات النبی''، مکمل ہوکر مسودہ صاف ہوکر رکھا ہوا ہے، لیکن طباعت واشاعت کی نوبت نہیں آئی، اس کی طباعت کے لئے چند مشہور اداروں اور مستند ہستیوں کو خط لکھا اور متوجہ کیا، افسوس کہ کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں آیا، بعض حضرات نے تو جوابی خط کا جواب تک

نہ دیا،...... واقعات النبیؐ‘‘ میری جملہ تالیفات میں محبوب ترین کتاب ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسو منتخب واقعات جوکہ سبق آموز دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں، دل کی خواہش ہے کہ کیسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کردئے جائیں۔

تعلیقات میں کشکول کے حصہ سے بھی انتخاب فرما سکتے ہیں، اگر میری دی ہوئی کتابیں ساتھ ہوں تو ان پر تبصرہ بھی فرما دیجئے۔ آپ نے اپنی قیمتی تالیفات مجھے دے کر جو عزت و محبت فرمائی اس کا دل سے شکریہ، یقینی استاذ مرحوم کی روح اس تعلق سے خوش ہوئی ہوگی‘‘

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب مرحوم:

فرانس کے مشہور شہر پیرس میں رہ کر اسلامی علوم وفنون کے بلند پایہ مخلص خدمت گزار، مشہور حیدر آبادی عالم و محقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو کون نہیں جانتا، دنیائے اسلام کی یہ عجیب وغریب مایۂ ناز ہستی ایک عرصہ تک یورپ کے کفرستان میں اسلام وایمان کی روشنی بکھیرتی رہی، ان کا بھی ایک خط قاضی صاحب کے نام ملاحظہ فرمائیے:

آج نوازش نامہ ملا، سرفراز ہوا...... آپ کی فاضلانہ کتاب کا ذکر سن چکا ہوں خاص کر بمبئی کے پروفیسر عبد الرحمٰن مؤمن صاحب سے، لیکن ادھر کی ڈاک اب انگریزوں کے زمانے کی طرح نہیں ہے، مشیة اللہ غـــالبة ، کتاب آپ کی اور تالیفوں کی طرح نفیس اور مفید ہی ہوگی، اور اس کی قطعاً محتاج نہیں کہ ایک ناچیز اس کا تعارف کرائے

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ۲۶/ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ

شبلی اکاڈیمی دار المصنفین اعظم گڈھ کے سابق ناظم مشہور اہل علم واہل قلم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی قاضی صاحب کو لکھتے ہیں کہ:

آپ کے مضامین محفوظ ہیں ان شاء اللہ جنوری یا فروری سے چھپیں گے، بمبئی

کے ماحول وہاں کی زندگی اور معاشی جد وجہد میں علمی ذوق کا قائم رکھنا آپ ہی کا کام ہے۔ ۲۴/دسمبر ۱۹۶۳ء

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے سنی شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا تقی امینی مرحوم نے ایک خط میں لکھا:

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے، آپ کے حال پر، جو اس قسم کے علمی کام (آپ سے) لے رہا ہے، بمبئی میں رہ کر یہ کام کرتے رہنا محض آپ کی کرامت ہے۔ ۲۵/جنوری ۱۹۷۳ء

حافظ غلام مرتضیٰ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کل لائبریری میں ''صدق جدید'' نظر آیا، اس میں ''حکومت کویت کی جانب سے ایک ہندوستانی عالم کو اعزاز'' کے عنوان کے تحت یہ خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ حکومت کویت نے آپ کو اپنے یہاں کے نشریاتی شعبہ کا معتمد اور مشیر قرار دیا ہے، میں اس موقع پر آپ کو صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، آپ ایک سادہ لیکن مصروف زندگی گزارتے ہوئے جو نمایاں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے پیش نظر آپ واقعی اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں نے آپ کی قابل قدر تصنیف رجال السند والہند کو بغداد میں جن جن اساتذہ کی خدمت میں پیش کیا، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی، اور جب اس کا ایک نسخہ المتحف العراقی کی لائبریری میں رکھوانے کے لئے لے گیا، تو اس کے ناظم جناب کورکیس عواد نے فرمایا کہ مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آج بھی ہندوستان میں عربی کے ایسے جلیل القدر علماء موجود ہیں۔ ۳۱/مارچ ۱۹۶۳ء

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ بھی قاضی صاحب کے بڑے قدرداں تھے، اس سلسلے میں ان کا ایک مکتوب گرامی پڑھئے:

''افسوس ہے کہ ۸/ جون کو جب میں بمبئی واپس ہوا تو آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، صرف چند گھنٹے قیام رہا، ایک خاندانی حادثہ کی اطلاع پا کر بہ عجلت وہاں سے روانہ ہوگیا، محمد بھائی کے یہاں آپ کا لفافہ ملا، جس میں انقلاب کے دو تین تراشے تھے، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، پہلی مرتبہ آپ کے قلم سے الهند في العهد الاسلامي کا ایک کثیر الاشاعت اخبار میں نام آیا، اور اس کا مختصر لیکن وقیع تعارف ہوگیا، اس کا ایک فوری فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنؤ کے قومی آواز میں ادارتی صفحہ پر ایک اچھا نوٹ، اس کتاب کی اشاعت کے متعلق دیا گیا، جو اول سے آخر تک آپ ہی کے مضمون پر مبنی اور اس سے ماخوذ تھا، اگرچہ ظاہر یہ ہوتا تھا کہ ان کو براہ راست اس کتاب کی طباعت کی اطلاع ملی ہے، اور وہ اس کو ایک علمی خبر کے طور پر شائع کر رہے ہیں۔ اس سے بھی بہت سے اہل علم اور اہل ذوق کو کتاب کے مکمل ہونے کی خبر مل گئی، یہ کتاب کا پہلا مطبوعہ نسخہ تھا، جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، میری اس وقت بھی نیت ہدیہ کی تھی، معلوم نہیں آپ کو کیوں تردد رہا؟

ابھی تک میرے پاس اس کا کوئی دوسرا نسخہ نہیں پہونچا............

مجھے تو پہلے خیال نہ تھا اور نہ کتاب پیش کرتے وقت یہ نیت تھی کہ آپ سے اس کتاب پر کچھ لکھنے کی فرمائش کروں، لیکن آپ کے اس مختصر مضمون کو پڑھ کر دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ آپ سے اس کتاب پر ایک مفصل مضمون اور تبصرہ کی درخواست کروں، جس کو آپ اشاعت کے لئے معارف میں بھیجیں، ہندوستان میں اس کتاب پر تبصرہ کرنے کا جن چند گنی چنی ہستیوں کو حق ہے، ان میں آپ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں، اس لئے کہ آپ کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر گہری نظر بھی ہے، اور آپ کا یہ موضوع بھی ہے، آپ مصنف کی کاوش ومحنت کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں، پھر آپ کا قلب اور قلم گروہی

عصبیتوں سے بھی پاک ہے، جو ہمارے اہل علم، اور اہل قلم کا پرانا مرض ہے، اس لئے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو، تو آپ پوری کتاب پر نظر ڈال کر ایک علمی مضمون معارف کے لئے سپرد قلم فرمائیں۔ والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

مولانا ابومحفوظ الکریم صاحب معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ......ان کے متعلق قاضی صاحب فرماتے تھے کہ میری نگاہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین عربی کے اسکالروں میں ہیں، اور انھوں نے میری کتاب ''رجال السند والہند'' حرف بحرف پڑھی ہے...... ایک خط میں لکھتے ہیں:

محترم المقام مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب

حرسہ اللہ ومتعنا بطول بقائہٖ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف بعافیت تمام باد، امید کہ آپ دیوبند سہارنپور سے بخیریت واپس پہنچ چکے ہوں گے، آپ کے غائبانہ راقم نے مبارک پور کی سیر کی، آپ سے نہ ملنے کا افسوس رہا، لیکن صاحبزادگان مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود حفظہما اللہ نے مہمان نوازی کا حق پوری مستعدی وانشراح صدر سے ایسا ادا کیا جس کی توقع بزمانۂ حال نہیں کی جاسکتی، فجزاہم اللہ احسن الجزاء وزادہم خیراً ومیراً۔

دارالمصنفین کی دعوت پر اعظم گڈھ کا سفر کرنا پڑا۔ ۱۸/اپریل دوشنبہ کو یہاں سے روانہ ہوا، ۱۹/اپریل سہ پہر کے لگ بھگ شاہ گنج اترا، اعظم گڈھ کی ٹرین جانے ہی والی تھی اس پر بیٹھ کر اعظم گڈھ پہونچا، دارالمصنفین پہونچتے پہونچتے ساڑھے چار شام کا وقت ہو چکا تھا، مؤرخہ ۲۰/اپریل دارالمصنفین کی نذر ہوا، ۲۱ کو مبارکپور جانا طے کرلیا کہ اب کی دفع آپ کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، علاوہ بریں یہ خیال بھی ہوا کہ زندگی میں تو مولانا عبید اللہ

مبارکپوری سے ملاقات میسر نہ آسکی، کم از کم سنت تعزیت تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مل کرادا ہو جائیگی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے بڑی فراخ دلی اور محبت سے کتب خانہ دارالمصنفین کے جواں سال ملازم مولوی ابو البرکات اصلاحی کو رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا، غرض مبارکپور کی آمد ورفت میں سہولت پیدا ہوگئی اور بڑا آرام رہا، آپ کو پیشگی اطلاع نہیں دی کہ دراصل یہ سفر تذبذب کے عالم میں کیا گیا، اورخود دارالمصنفین کو اپنے پہونچنے کی خبر صرف ٹیلیگرام کے ذریعہ بھیجی، ٹیلیگرام کی رفتار بھی ایسی ثابت ہوئی کہ اس سے پہلے بندہ خود دارالمصنفین جا پہنچا، اور مبارکپور سے واپسی پر ۲۲/اپریل کی صبح تک شاید ہمارا ٹیلیگرام نہیں پہونچ پایا۔

مبارکپور کی یاد اب مشہود ہونے کے بعد تو نقش برحجر ہے، واپسی میں اعظم گڈھ پہونچتے پہونچتے کچھ اشعار موضوع ہوئے جو کلکتہ پہونچ کر اتمام کو پہونچے، آپ کو مولانا ظفر مسعود نے کچھ تفصیلات بتائی ہوں گی، ان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انھوں نے اپنی موٹر بائیک پر بیٹھا کر رسول پور کی بھی سیر کرادی، فجزاہ اللہ خیراً۔

باقی باتوں کا اندازہ اس شعری دستاویز سے کیجئے جو اپنی نااہلی کی دلیل ہے:

قصة المسير إلىٰ مبارك فور

(فی الیوم التاسع من ذی القعدة ۱۴۱۴ھ وفق الحادي والعشرين من شهر إبريل ۱۹۹۴م)

أعـظم بيوم سرت من "أعظم كر" ا معی أبو البركات، خرّيت حری

كانت (مبارك فور) غاية مذهبی حتـی انتهيـت أمـام منزل (أطهر)

ای الشيخ المؤقر مولانا القاضی اطهر حرسه الله ومتعنا ببقائه الطويل

فوجدتهٔ عن داره متنائياً إذ لم يكن أخبرتهٔ بتصدّرى
هو في (سهارنفور) أو جنباتها ما بين كتب خزائن والمحبر
غررا يؤلف درها وعقيقها في سلك منتظم بهيّ المنظر
فلقيت حساناً وبعد هنيهة "ظفرا" وقد أتيا بوجه مسفر

حسان بن مسعود و ظفر مسعود حرسهما الله من أنجال صديقنا القاضي الأطهر حفهم الله بنعمائه

فاستوقفاني دون ما متكلف واستبشرا بي، دون أي تأخر
لله درهما و در أبيهما طبعوا على كرم و طيبة عنصر
ومضى بنا 'ظفر' إلى دار المحدّ دِثُ، من توفى قبل عدة أشهر

أي الشيخ الكبير مولانا عبيد الله المباركفوري رحمه الله

قابلت نجليه على وجه العزا ءِ، وفاح طيب الأصل من فرع طرى

أحدهما مولانا عبد الرحمٰن وهو وأخوه كلاهما من الفضلاء حفظهما الله

وإذا أبو الحسن الإمام، برهطه وافى هنالك واستحث، بمحضري

أي الشيخ العلامة الهمام ابوالحسن علي الندوي أبقاه الله ورفاقه الكرام

فمضوا إلى غاياتهم، ومضيت من مغنى 'المحدث'، صوب مغنى 'أطهر'
فأتى بنا 'ظفر' إلىٰ دهليزه حيث استرحنا من كلال يعتري
وأتىٰ عقيب (الظهر) غدّانا بكلـ لِ اطايب ومطايب المتخيَّر
هذا، وأردفني علىٰ دراجة ألية قد ساقها بتمهر
فخرجت نحو مقابر معهودة وتهمني منها ثلاثه أقبر
ذا قبر مولانا عبيد الله، من خدم الحديث وعاش غير مقصِّر

متورعــاً، متـواضعــاً، متخشعـاً نشـر الـحـديـث بـفكره والمزمر
’مـرعـاتـه‘ دلـت علىٰ إحـرازه مـن سـنة الهـادي بـحـظ أوفـر
وهناک قبر الشيخ صاحب ’تحفة‘ ضـمـنـت شـفـاء مزورا وممترى

أي الشيخ المحدث مولانا عبد الرحمٰن المباركفوري رحمه الله المتوفى في ١٦ شوال ۱۳۵۳ھ وفق ۱۹۳۵م

’برسول فور‘ ضريح(أحمد) حائز عـربيّة وطـراز شعـر البـحـتـري

أي الشيخ الأديب الكبير مولانا أحمد حسين بن عبد الرحيم رحمه الله كان من أصدقاء أبي غفر لهما الله وقد رأيته في طفولتي وهو جد صديقنا ’قاضي أطهر‘ من جهة أمه المرحومة

زهـداً وعـلـمـاً زاخـراً وتـورعـاً وجـمـال مـعـروف وردّ الـمنكر
بـطـلاقة بـدوية وطـلاوة حـضـرية، وبهاء جـودة عبـقـر
و’الـعصر‘ صلينا بمسجدها، وزُرُ نـا دار هـذا الـمضـرحي العبقري
حـوت الـقـبـور مـعـالـمـاً علمية عـمـلية أعيـت لسـان معبِّـر
بحبوحة الفردوس يدخلهم وجمـ ـع الـمـؤمـنـيـن بـديـنـه المتيسر
سـردي لـقـصـتي الـعـجيبة منبئ عـمـا بـه امتـازت سلالة ’أطهـر‘
حيـاهـمـو رب الـورىٰ بيـاهـمو فـي مـنتهـى دعة وعيش مـزهـر
ثـم انـصـرفـنـا شـاكرين لجمعهم عـوداً عـلـىٰ بـدءٍ، إلىٰ ’أعظم كر‘

ترجمہ

مبارکپور کا سفر

۹/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۲۱/ اپریل ۱۹۹۴ء

☆ وہ دن کتنا بابرکت اور عظمت والا تھا، جب میں اعظم گڈھ شہر سے روانہ ہوا، اور میرے ساتھ ایک معتبر رہبر مولوی ابوالبرکات صاحب تھے۔

☆ قصبہ مبارکپور میرے اس سفر کی منزل تھا، میں قاضی اطہر صاحب کے مکان پر پہونچا۔
☆ مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر سے باہر دور گئے ہوئے ہیں، پہلے سے میں نے انھیں آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔
☆ وہ سہارنپور میں یا اسی علاقہ میں کہیں قرطاس وقلم کے درمیان ہیں۔
☆ جہاں وہ علم وفن کے حسین موتیوں اور جواہر پاروں کو تصنیف وتالیف کی لڑی میں پرو رہے ہیں۔
☆ وہاں میری ملاقات پہلے حسان سے ہوئی، پھر تھوڑی دیر کے بعد مولوی ظفر مسعود سے ہوئی، دونوں بہت ہی خندہ پیشانی سے ملے۔

(حسان احمد اور مولوی ظفر مسعود، قاضی صاحب کے صاحبزادگان گرامی ہیں)

☆ صاحبزادگان محترم نے بے تکلفی اور بشاشت کے ساتھ مجھے اپنے گھر ٹھہرایا، انھیں اس سے بڑی مسرت ہوئی۔
☆ دونوں کیا خوب فرزند ہیں، اور ان کے والد محترم بھی کیا خوب ہیں، نہایت شریف اور پاک طینت لوگ ہیں۔
☆ پھر مولوی ظفر مسعود مجھے ان محدث کے گھر لے گئے، جن کا ابھی چند ماہ پہلے انتقال ہوا ہے۔

(یعنی شیخ کبیر مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ)

☆ میں ان کے دو صاحبزادوں سے بطور تعزیت کے ملا، اس تازہ شاخ سے اصل کی خوشبو محسوس ہوئی۔

(ایک مولانا عبدالرحمٰن صاحب اور دوسرے ان کے بھائی مولانا عبدالعزیز صاحب دونوں عالم وفاضل ہیں)

☆ وہاں اتفاقاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی موجود تھے، میری حاضری سے وہ خوش ہوئے۔

☆ پھر سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے، اور میں بھی وہاں سے قاضی اطہر صاحب کے گھر آ گیا۔

☆ ظفر مسعود اپنے گھر لے آئے اور ان کی بیٹھک مین ہم نے آرام کیا۔

☆ ظہر کی نماز کے بعد انھوں نے کھانا کھلایا، عمدہ اور لذیذ کھانا۔

☆ پھر انھوں نے اپنی موٹر سائیکل پر مجھے بیٹھایا، اور بڑی مہارت سے چلا کر لے گئے۔

☆ یہ مولانا عبیداللہ صاحب کی قبر ہے، جنھوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، اور اچھی خاصی بابرکت زندگی گزاری ہے۔

☆ صاحب ورع تھے، متواضع اور خاشع وخاضع تھے، انھوں نے حدیث کی نشر واشاعت اپنی فکرو ذہانت سے بھی کی اور تحریر و کتابت سے بھی۔

☆ ان کی کتاب مرعاۃ المفاتیح، اس بات کی دلیل ہے کہ ہادیٔ اکرم ﷺ کی سنتوں سے انھوں نے حظ وافر پایا تھا۔

☆ وہیں صاحب تحفۃ الاحوذی کی بھی قبر ہے، تحفۃ الاحوذی جو ہر شک وتزویر کے لئے شفا ہے۔

(یعنی شیخ محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری علیہ الرحمہ متوفی ۱۶ر شوال ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۵ء)

☆ رسول پور میں مولانا احمد حسین صاحب کا مرقد ہے، جو علوم عربیت کے ماہر اور بحتری کے طرز کے شاعر تھے۔

(یعنی شیخ ادیب کبیر مولانا احمد حسین ابن عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد محترم کے دوستوں میں سے تھے، میں نے بچپن میں ان کی زیارت کی تھی، وہ ہمارے دوست قاضی

اطہر صاحب کے نانا تھے)

☆ وہ صاحب زہد وورع تھے، علم کے بحر ذخار تھے، نیکی وسعادت کے جمال اور برائی کی سراپا تردید تھے۔
☆ انھیں بدوی طلاقت، شہری جگمگاہٹ اور عمدگی کی رونق حاصل تھی۔
☆ ہم نے عصر کی نماز وہیں کی مسجد میں پڑھی، اور ان بزرگ کے گھر کی زیارت کی۔
☆ یہ قبریں ایسے علمی وعملی کمالات کو سمیٹے ہوئے ہیں جن کے بیان سے زبانیں قاصر ہیں۔
☆ اللہ تعالیٰ ان پر بھی اور ہم پر بھی رحم فرمائے اور اپنے فضل عمیم سے سب کی مغفرت فرمائیں۔
☆ انھیں اور تمام مسلمانوں کو اپنے دین یسیر کے طفیل باغ فردوس میں جگہ عطا فرمائیں۔
☆ میرے اس بیان واقعہ سے قاضی اطہر صاحب کے خاندان کے امتیازات نمایاں ہیں۔
☆ رب کائنات انھیں انتہائی خوشحالی اور پھلتی پھولتی زندگانی عطا فرمائے۔
☆ پھر ہم ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جہاں سے چلے تھے وہیں یعنی اعظم گڈھ شہر لوٹ آئے۔

میری یاوہ گوئی سے درگذر فرمایئے اور دعا فرمایئے کہ بقیہ زندگی لاف زنی کے بجائے فکرِ آخرت میں گذرے۔ ابھی ایک بڑے سانحہ سے یوں دوچار ہوا کہ میری بیوی ۷/مارچ (۱۹۹۴ء) یعنی ۲۴/رمضان ۱۴۱۴ھ کو صبح ۹/بجے انتقال کرگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون

۴/فروری کو اچانک بیہوش ہوگئی، آج کل کی زبان میں جس کو ''کوما'' میں چلاجانا کہتے ہیں، فوراً اسپتال میں داخل کیا اور انتہائی احتیاطی وارڈ I.T. میں رکھ کر

تدبیریں کی گئیں جولا حاصل رہیں اور مشیت ایزدی کے آگے سرخم کرنا ہی پڑا، بحمداللہ علاج کی دوادوش بھی داووا عباداللہ ''الحدیث'' کے تحت شروع کی تھی اور نتیجہ جونکلا اس پر بھی اناللہ وانا الیہ راجعون ہی موجب سکون وتحمل ہے۔آپ بھی رحمت ومغفرت کی دعا فردیں۔عزیزان کو میں نے دانستہ اس کی اطلاع نہین دی تھی اب جو آپ دعا فرمائیں گےتو وہ بھی آمین کہنے مین شریک ہوجائیں گے،

جملہ عزیزان و متعلقین کوعلیٰ قدر مراتب سلام ودعا،اور مولانا ظفر مسعود اور حسان مسعود صاحبان کوخصوصی سلام وشکریہ۔

اپنی اور عزیزان کی خیریت وعافیت سے حسب موقع مطلع فرمائیں

والسلام

ابومحفوظ الکریم معصومی

جمعہ ۱۷/ذوالقعدہ ۱۴۱۴ھ۔۔۲۹/اپریل ۱۹۹۴ء

1/33 ۔سی،ہرے کرشنا کونار روڈ کلکتہ۔700014

جناب اصغر مجاہد صاحب سکریٹری تنظیم فکر ونظر، سندھ، پاکستان لکھتے ہیں:

محترم حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ہر طرح بعافیت ہوں گے۔

حضرت قاضی صاحب! برصغیر پاک وہند کے سب اہلِ علم ،اہل فکر ونظر، مؤرخ، محقق، آپ کے شکر گذار ہیں کہ آپ نے ''مسلمانوں کی عظمت رفتہ'' کو جس طریقے سے اجاگر کیا ہے کہ مسلمانوں کا تابناک وشاندار ماضی، چاند وسورج سے بھی زیادہ روشن نظر آرہا ہے، دنیا کے چاند وسورج تو ابھرتے

وڈو بتے ہیں گے، مگر آپ کا روشن کیا ہوا محققانہ سورج رہتی دنیا تک یونہی چمکتا دمکتا رہے گا، خشک وسوکھے ہوئے ذہنوں کو آبِ حیات کی طرح سیراب کرتا رہے گا۔ یہ علم وادب کی ایسی روشنی ہے جو کبھی بھی ماند نہیں ہوتی، آپ کا تاریخ انسانیت پر عموماً اور تاریخ اسلام پر خصوصاً بڑا احسان اور قرض ہے، جو اتارے نہیں اترتا۔ یہ قرض اس طرح اتر سکتا ہے کہ آپ کی سب کتب کا دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کی تاریخ عزیمت سے مُسلم تو کیا غیر مُسلم بھی باخبر ہو جائیں، بلا مبالغہ آپ تاریخ انسانیت اور تاریخ اسلام کے محسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطاء فرمائے۔ آمین!

آپ کی دو کتابیں سندھی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو گئی، جو انشاء اللہ عنقریب آپ کی خدمت میں ارسال کی جائیں گی۔

پاکستان کے معروف اہل قلم ومصنف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر وفکر کے داعی حضرت علامہ طالب ہاشمی صاحب کو صدر تنظیم جناب پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب نے ان کی علمی ودینی خدمات کے پیش نظر آپ کی کتابوں کا سیٹ تحفتاً دیا، جنھیں پڑھ کر موصوف نے جناب بھٹو صاحب کے نام شکریہ کا خط لکھا ہے ، اور فرمایا ہے کہ ''مجھے قاضی صاحب کی کتابوں سے اپنی زیر تالیف کتب کی تکمیل کیلئے بہت بڑا مواد ملا ہے'' (ہاشمی صاحب کے خط کی نقل پیش خدمت ہے)

علامہ ہاشمی صاحب نے آپ کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کے حصول کیلئے اشد ضرورت کا اظہار فرمایا ہے، اس خط کی روشنی میں ہم آپ کی خدمت عالیہ میں ادب واحترام سے عرض کرتے ہیں کہ آپ اپنی بلند پایہ کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی کچھ کاپیاں ارسال فرمائیں، ہم آپ کے ممنون ومشکور ہوں گے۔

آنجناب سے استدعاء ہے کہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ہی میرا پُر خلوص سلام میرے پیارے بھائی اور دوست جناب حسان احمد صاحب تک پہونچا ئیں، اللہ کرے آپ ہمیشہ خیر و عافیت سے ہوں۔ والسلام

آپ کا مخلص، احقر اصغر مجاہد

جوائنٹ سکریٹری تنظیم فکر ونظر سندھ (پاکستان)

محترم جناب طالب ہاشمی صاحب کے خط کا اقتباس پیش خدمت ہے:

جناب مخدوم و معظم مجاہد اسلام پروفیسر صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

لاہور میں آپ کی صحبت میں جو لمحات میسر آئے وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔

آپ نے مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری کی تالیفات کی صورت میں جن گرانقدر ہدیوں سے نوازا، ان کیلئے صمیم قلب سے سپاس گذار ہوں۔ میرا احساس تشکر اور بھی بڑھ گیا جب ان بلند پایہ کتابوں کو اپنی زیر تالیف کتابوں کی تکمیل کیلئے نہایت کارآمد پایا، بخدا آپ کیلئے دل سے دعائیں نکلیں ۔ یہ کتابیں اور دوسرا لٹریچر پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ جو مہتم بالشان ملی خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی،

علاوہ ازیں مجھے قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتاب ''اسلامی ہند کی عظمت رفتہ'' کی اشد ضرورت ہے، اگر یہ کتاب یا اس کی فوٹو اسٹیٹ مہیا فرماسکیں تو آپ کا احسان ہوگا، اس پر جو خرچ بھی آئے اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

والسلام مع الاکرام

دعا گو، طالب ہاشمی غفرلہٗ

مولانا لقمان سلفی صاحب ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دارالافتاء۔الریاض ذو المجد والکرم حضرت قاضی صاحب، مدظلہ

۵/جون ۱۹۶۸ء السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے، میں بھی آپ کی دعاؤں سے بخیر ہوں۔

کل ''المنہل''میں آپ کا خط عبدالقدوس انصاری صاحب کے نام پڑھا، بے حد خوشی ہوئی، انھوں نے آپ کو بھی عدد مذکور کا ایک نسخہ بھیجا ہے ،امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

آپ کی تحقیقی کتابیں اصحاب علم ودانش کیلئے خزینہ کی حیثیت رکھتی ہیں، امید ہے کہ آپ کی کتاب ''العقد الثمین'' جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر آجائے گی، میں اپنے کو خوش قسمت سمجھوں گا اور میرے احساس کی رفعت کا باعث ہوگا اگر ایک نسخہ سے مجھے بھی نوازا جائے۔

میری تو رائے ہے کہ آپ مملکت سعودیہ کے مجلوں اور جرائد میں گاہے گاہے اپنے مضامین ضرور بھیجتے رہیں، علمی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کریں گے، اب آہستہ آہستہ یہ علم کی قدر پہچاننے لگے ہیں۔

کل بھائی خالد کمال کا خط آیا تھا، خیریت سے ہیں، اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے، اور معذرت کی ہے، ان کی چھٹی ۸/ربیع الثانی سے شروع ہوگی، انکے کام سے نائب مفتی خوش ہیں، خدا مزید کی توفیق دے،

میں دارالافتاء میں مستقل ہوگیا ہوں، یہ خدا کا کرم ہے، اب کوئی قانونی پریشانی باقی نہیں رہی ہے، امید ہے کہ جواب سے ضرور نوازیں گے، میں

آپ کو اپنا بزرگ اور نہایت مخلص بزرگ مانتا ہوں ، آپ کی علمی گیرائی کے ساتھ بے حد سادگی اور تقویٰ مجھے ہمیشہ دعوت فکروعمل دیتے رہتے ہیں ۔ جناب قمر صاحب اور دیگر پُرسانِ حال کو سلام کہیں ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ طالب دعا

محمد لقمان سلفی

قاضی صاحب کے نام ایک تعزیتی مکتوب

محترم المقام جناب الحاج مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری السلام علیکم

ایک خط روانہ کر دیا ہوں ، ملا ہوگا ، ابھی ابھی مبارکپور سے حاجی ظفر مسعود سلمہٗ کا خط ملا جس سے معلوم کر کے بیحد افسوس ہوا کہ آپ کے والد محترم کا (۱) انتقال ہو گیا ، مرحوم کا ایسے وقت جدا ہو جانا جب کہ آپ نہ صرف وطن بلکہ ملک سے ہزاروں میل دور ہیں ۔ ظاہر ہے آپ کے لئے زبردست اور نا قابل برداشت المیہ ہے مگر مرضیٔ مولیٰ کے آگے ہر انسان مجبور ہے ۔ آپ اور خالد کمال سلمہٗ صبر کیجئے ۔ میں بحیثیت ایک دیرینہ رفیق اور قریبی دوست اور اگر کہوں تو سب سے زیادہ مخلص ہونے کے ناطے اس حادثہ پر بے حد غم زدہ ہوں آپ سب لوگوں کو صبر جمیل کے لئے تلقین کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین منزل عنایت فرمائے ، آمین !

ظفر مسعود سلمہٗ کے خط کا ایک روشن پہلو بڑا ہی خوش کن رہا کہ جب والد مرحوم کی قبر کی کھدائی آپ کی والدہ مرحومہ (۲) (جن کو انتقال فرمائے ہوئے ۴۴ سال گزرے ہیں) کے پہلو میں ہو رہی تھیں تو ایک سوراخ نظر آیا ، کفن تو کالا ہو چکا تھا مگر پھٹا نہیں تھا ، اور والدہ کی نعش مبارک بالکل صحیح وسالم حالت میں پائی گئی ، اس سے ان کے عذاب قبر سے محفوظ رہنے اور جنتی ہونے کی دنیا ہی میں سب لوگوں کو بشارت ہو گئی ، اور لوگ جوق در جوق اس منظر کو دیکھنے کے لئے جمع ہونے لگے ، اس سے آپ کے گھر والوں نے غم واندوہ کے ساتھ ساتھ خوشی ومسرت کے آنسو بھی بہائے ،

اس لئے آپ کی تربیت دینے والی اس جنتی ماں کے دنیا میں ہی ثبوت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں، جن کے نیک اور......خون کی آمیزش آپ کے ایک ایک قطرہ خون میں گردش کررہی ہے، اور جن کی دعاؤں کے طفیل آپ کو تمام ممالک اسلامیہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہورہی ہے، خدا آپ کی ساری خدمات دینیہ کو قبول فرمائے اور پھر مکرر طور پر میری جانب سے میرے ساتھیوں اور رفقاء کار کی جانب سے آپ کو صبر کی تلقین ہے، کمالِ حبیب الرحمٰن، انیس الرحمٰن، صلاح الدین اور عرفان سلام کہتے ہیں، مولوی خالد کمال کو بھی سب کا سلام قبول ہو،

والسلام

قمر (مولانا عبید الرحمٰن صاحب قمر) مبارکپوری

بمبئی۔ ۴/مارچ ۱۹۷۸ء

---

(۱) میاں جی محمد حسن، متوفی ۲۸/فروری ۱۹۷۸ء

(۲) حمیدہ بنت حضرت مولانا حکیم احمد حسین صاحب، (متوفیہ ۲۲/ذی قعدی ۱۳۵۲ھ)

قاضی صاحبؒ اور اہل سندھ

ضیاء الحق خیرآبادی، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور

قاضی صاحب کو جس چیز نے علم وتحقیق کی دنیا میں شہرت وعروج اور بقائے دوام عطا کیا وہ ان کا خاص موضوع ''عرب وہند وسندھ کے تعلقات'' ہے، اس موضوع پر سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے قلم اٹھایا، اس کے بعد قاضی صاحب نے اسے مستقل موضوع بنا کر اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر کے نہایت تفصیل وتحقیق سے اس پر بحث کی، اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا، اور اس زبردست تاریخی خلاء کو پُر کر دیا جو صدیوں پر محیط تھا۔

اس اہم تاریخی سلسلے کی ابتداء بھی ایک عجیب وغریب انداز سے ہوئی جس پر چل آگے علم وتحقیق کی یہ عظیم الشان عمارت کھڑی ہوئی، اس داستان کو خود قاضی صاحب ہی زبانی سنئے:

ایک روز احمد امین کی ''ضحیٰ الاسلام'' کا مطالعہ کر رہا تھا جس میں مشہور امام لغت وادب ابن الاعرابی کے متعلق **کان اصلہٗ سندیاً** دیکھا تو ذہن میں فوراً یہ بات آئی کہ اتنا عظیم امام لغت سندی الاصل ہے، معلوم نہیں کیسے کیسے اہل علم وفضل سندی ھندی ہوں گے جن کا ہم کو علم نہیں ہے، وقت وقت کی بات ہے، ورنہ اس سے پہلے دیوان حماسہ وغیرہ میں ابوعطاء السندی کے اشعار بار بار نظر سے گزرے مگر اس کا احساس نہیں ہوا، بس اسی وقت ابن الاعرابی کا تذکرہ نقل کیا اور اس کا سلسلہ چل پڑا جو آخر میں **رجال السند والھند** کی شکل میں

سامنے آیا،''تهيج صغيرات الامور كبيرها '' بالکل صحیح ہے،

اب رات دن چلتے پھرتے حتیٰ کہ کھانا کھاتے وقت بھی تاریخ ورجال کی کتابیں مطالعہ کرنے لگا، ایک دن میں کئی کئی کتابیں سرسری طور سے دیکھتا اور جہاں کوئی سندھی اورھندی شخصیت نظر آتی فوراً نقل کرلیتا، ایک دن کتب خانہ کے ناظم نے کہا کہ مولانا ساری کتابیں کمرے میں لیجایئے تاکہ بار بار داخل خارج نہ کرنا پڑے، **رجال السند والهند** کے مسوّدے کے پہلے صفحہ پر یہ عبارت درج ہے۔''إبتداء التاليف فی ۱۲/ جمادى الاخرىٰ ۱۳۶۸ھ و ذٰلک فی الجامعة الاسلامية ،دابيل (سورت) التدوين جارٍ''

اس موضوع پر قاضی صاحب نے آٹھ نہایت محققانہ کتابیں تیار کردیں، جس میں پہلی کتاب رجال السند والهند ہے، جس کا تفصیلی تعارف اسی شمارہ میں درج ہے، (۲) عرب وہند عہد رسالت میں (۳) ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں (۴) العقد الثمين فی فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين (اس کا تعارف بھی اس خاص نمبر میں موجود ہے)(۵) اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (۶) خلافت راشدہ اور ہندوستان (۷) خلافتِ امویہ اور ہندوستان (۸) خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔

اس علمی سلسلہ کی پذیرائی تو تمام علمی دنیا نے کی اور قاضی صاحب کی تلاش وتحقیق اورنکتہ رسی کی داد دی، مگر اہل سندھ کو اس عموم میں خصوص حاصل ہے، اس لئے کہ ان کتابوں کا موضوع ہندوستان میں اسلام کی پہلی چار صدیوں کی تاریخ ہے جس کا زیادہ تر تعلق سندھ ومکران وغیرہ سے ہے، اس لئے اہل پاکستان (سندھ) نے اسے اپنی تاریخ قرار دیا، اور اب تک اس علاقہ اور اس دور کی اتنی مفصل ومرتب تاریخ نہیں لکھی گئی تھی اس لئے اس کو ایک نادر دریافت کی حیثیت حاصل ہوگئی، سکھر کی فعال

ومتحرک تنظیم ''تنظیم فکرونظر'' نے ان تمام کتابوں کونہایت اعلیٰ معیار پر شائع کیا اور اس کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا، اور اس کے رسم اجراء کے موقع پر مصنف کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا اور ان کی حد درجہ عزت افزائی کی، اور انھیں ''محسن سندھ'' کا خطاب دیا، اس مضمون میں ہم اہل سندھ کے مکاتیب، تحریروں اور ان کے بیانات کے اقتباسات پیش کریں گے، جس سے قاضی صاحب کے تئیں اہل سندھ کی شیفتگی ووارفتگی اور عقیدت ومحبت کا پتہ چلتا ہے، اس کی ابتداء صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم ...... جو قاضی صاحبؒ کے بڑے قدرداں تھے ...... کے ایک خط سے کررہے ہیں جو انھوں نے تنظیم فکرونظر سندھ کے صدر پروفیسر اسداللہ بھٹو صاحب کو لکھا، صدر مرحوم لکھتے ہیں:

''اگر چہ آپ کی بھیجی ہوئی ساری کتب ہی قابل قدر ہیں، لیکن میں قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کی کتب ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' اور ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کا بطور خاص ذکر کروں گا، اور ان کی عرق ریزی اور محققانہ دیانت داری کی داد دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتب تاریخ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ رہنمائی فراہم کرتی رہیں گی۔

میری طرف سے ایک دفعہ پھر اتنی جامع اور مفید کتاب شائع کرنے پر مبارکباد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کی ان نیک کوششوں کو استقامت عطا فرمائے، آمین خیراندیش

محمد ضیاء الحق

قاضی صاحب کی پہلی ملاقات صدر مرحوم سے ۱۴۰۰ھ میں ہوئی، جب قاضی صاحب تیسری عالمی قرآن کانفرنس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں شرکت کیلئے اسلام آباد تشریف لے گئے تھے، قاضی صاحب صدرِ محترم کے بارے میں لکھتے ہیں ''کانفرنس میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم شریک تھے، ان سے بار بار ملاقات ہوتی تھی،

مرحوم سے جو شخص ایک بار ملتا تھا محسوس کرتا تھا کہ وہ اس سے خاص تعلق رکھتے ہیں، یہ مرحوم کے اخلاق کی خوبی تھی، میں بھی یہی محسوس کرتا تھا، انھوں نے مجھے ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلیٰ اور ایک حمائل شریف ہدیہ دیا ہے، ان سے خصوصی مجلسوں میں بار بار ملاقات ہوتی رہی''

قاضی صاحب کی دوسری ملاقات ۱۹۸۴ء میں ہوئی، جب قاضی صاحب مارچ ۱۹۸۴ء میں تنظیم فکر ونظر سندھ (سکھر) کی طرف سے منعقدہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی ادبی میلے میں شریک ہوئے، قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم صدر پاکستان کی زیر صدارت جلسہ ہوا، جس میں صدرِ محترم کے ہاتھوں سندھ کی روایتی ٹوپی اور تنظیم فکر ونظر کا اعزازی نشان دیا گیا''

قاضی صاحب کا تیسرا سفر پاکستان اگست ۱۹۸۶ء میں ان کتابوں کے رسم اجراء اور تعارفی تقریب کے سلسلے میں ہوا جسے تنظیم فکر ونظر نے شائع کیا تھا، قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ۶/اگست کو ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کے بعد ۷/بجے شام کو کراچی ہوائی اڈے پر اترے، تنظیم فکر ونظر کے صدر پروفیسر اسداللہ بھٹو اور سکریٹری قربان علی اور دیگر کئی ارکان موجود تھے، ان حضرات نے بے پناہ خلوص ومحبت سے استقبال کیا اور ہوٹل جبیز JABIES (جنت جبیز) کراچی میں قیام کا انتظام کیا، کتابوں کا اجراء اور تعارفی جلسہ ۷/اگست کو ہونے والا تھا، مگر صدر جلسہ سید غوث علی شاہ وزیر اعلیٰ سندھ کے پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے ۱۰/اگست کو ہوا، اسلئے دو دن آرام اور ملاقات کیلئے مل گئے،

پروفیسر اسداللہ بھٹو سندھ کے سکریٹریٹ لوا گئے اور کئی اہم شخصیتوں سے تعارف کرایا، تمام لوگ بڑے خلوص ومحبت سے ملے، اور سب ہی یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے ہندوستان میں رہ کر ہمارے ملک سندھ کی اسلامی تاریخ پر وہ کام کیا ہے جو ابتک نہیں ہوا تھا اور ہم اپنے ماضی سے بے خبر تھے، ہمارے پاس چچ نامہ کے علاوہ

یہاں کی اسلامی تاریخ کے بارے میں کچھ نہیں تھا، ہم سب آپ کے احسان منداور شکر گذار ہیں،

(جن اہم شخصیات سے ملاقات ہوئی ان میں پاکستان کے مشہور دانشور بین الاقوامی حیثیت کے مالک جناب خالدایم اسحاق صاحب،......ان کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں: بڑے علم دوست بلکہ علم پرور شخص ہیں، بلامبالغہ لاکھوں کتابیں ان کے ذاتی کتب خانہ میں ہیں، اور ہرسال لاکھوں روپیہ کتابوں کی خریداری پرخرچ کرتے ہیں'' ...... پروفیسر ذیشان خٹک سابق وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور، سراج منیر صاحب ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، اور عبدالرحمٰن صاحب وغیرہ تھے،)

فاران کلب کی تقریب:۔ فاران کلب کراچی میں اہل علم اورارباب ذوق کا ادارہ ہے جوموقع بموقع علمی اور ثقافتی پروگرام پیش کرتا رہتا ہے، عبدالرحمٰن صاحب اس کے روح رواں ہیں، کلب کی طرف سے مہمانوں کے اعزاز میں ظہرانہ کا انتظام کیا گیا۔ اس تقریب میں بہت سے اہل علم، دانشوراور صحافی شریک ہوئے، کھانے کے بعد ہال میں جلسہ ہوا، موضوع سخن میری کتابیں تھیں،

جناب سراج منیر اور پروفیسر ذیشان خٹک اور دوسرے مقررین نے بڑی فراخدلی سے حوصلہ مندانہ باتیں کیں، اور برملا اعتراف کیا کہ ہم آج تک اپنی تاریخ کے اس قدیم سرمایہ سے محروم تھے، ہم کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اس ملک میں صحابہ وتابعین کی آمد ہوئی ہے، اور عہد رسالت ہی سے اس ملک کو اسلام اور مسلمانوں سے تعلق پیدا ہوگیا تھا، ان کتابوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں اوراب ہم اپنی تاریخ کے انقلابی موڑ پر آ گئے ہیں اور ہمارے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے، ہمارے پاس محمد بن قاسم سے پہلے اوران کے بعد کی تاریخ پر کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ ان کتابوں کولکھ کر ایک شخص نے ایک ادارے کا کام کیا ہے۔ غرض سب ہی مقررین نے میری کتابوں کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا۔''

کتابوں کی ''تعارفی تقریب'' کی تفصیلات

تاریخ:۔ ۱۰/اگست ۱۹۸۶ء بروز اتوار وقت ۷/بجے شام

مقام:۔ تاج ہوٹل۔شاہراہ فیصل کراچی

صدارت:۔ جناب جسٹس غوث علی شاہ (وزیر اعلیٰ سندھ)

مہمان خصوصی:۔ محترم مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری (بھارت)

خطبۂ استقبالیہ:۔ پروفیسر اسد اللہ بھٹو، صدر تنظیم فکر ونظر سندھ

مُقَــــــرِّرین

☆☆☆ جناب خالد اایم سحاق صاحب، سرپرست تنظیم فکر ونظر سندھ

☆☆☆ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

☆☆☆ جناب پروفیسر ذیشان خٹک سابق وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پشاور

☆☆☆ جناب پروفیسر ایاز قادری صاحب صدر شعبہ سُندھی کراچی یونیورسٹی

☆☆☆ جناب سراج منیر صاحب ڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

خطبۂ استقبالیہ کے چند اقتباسات

عزت مآب جسٹس سید غوث علی شاہ صاحب، قابل صد احترام مولانا اطہر مبارکپوری صاحب، محترم خالد اسحاق صاحب!.............................

............حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب ایک عہد ساز انسان، اخلاص ومحبت اسلامی کردار اور اخلاق کا ایک پیکر ہیں، خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کیلئے اعظم گڈھ (بھارت) سے تشریف آوری ایک ایسا احسان عظیم ہے، جس کا شکریہ ہم الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے، اس مرد درویش نے بمبئی میں تیس سال علم تحقیق کے موتی بکھیرے ہیں، اور نہایت اعلیٰ معیار پر بائیس کتابیں لکھی ہیں، جن کی علمیت

اور دانائی کا پورے عالم اسلام میں چرچا ہے، ان کی لافانی تصنیف ''رجال السند والہند '' نے عرب وعجم میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی،

ان کی دوسری کتب (۱) ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' (۲) ''خلافت راشدہ اور ہندوستان'' (۳) ''خلافت امویہ اور ہندوستان'' (۴) ''خلافت عباسیہ اور ہندوستان'' کی دوبارہ اشاعت کا عظیم شرف تنظیم فکرونظر سندھ کو حاصل ہے، ان کتابوں میں تاریخ اسلام کے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے جس کا حق شاید اس سے پہلے ایسے جامع و بلیغ اور اعلیٰ معیار پر کسی نے ادا نہ کیا ہو۔

حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک سے لے کر عباسی دور تک عرب اور سندھ و ہند کے تعلقات اور اسلام کی شاعت، جہاد، تہذیب وثقافت، تجارت اور محدثین، مفسرین، فقہائے کرام، صوفیائے عظام، علمائے دین اور بزرگوں کی خدمات اور کارناموں کے متعلق یکجا اتنی کثیر اور نایاب معلومات دوسرا کوئی مصنف نہیں کرسکا ہے، مولانا محترم نے برسہابرس تک خون اور پسینے کی محنت سے قرآن وسنت، سیرت وفقہ اور تاریخ ومغازی کی سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کر کے یہ موتی اور لعل وجواہر قارئین کے دامن میں پیش کئے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ماخذوں اور حوالوں کی تفصیل دیکر آئندہ کیلئے دانشوروں اور تشنگان علم کیلئے تحقیق کے دروازے کھول دئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے تاریخ اسلام کا ابتدائی لیکن اہم ترین باب جو اہل سندھ اور اہل ہند...... واقع نہیں تھا اور اٹکلوں کے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے مولانا موصوف نے تاریخ کے ان گمشدہ سلسلوں کو تلاش کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین سندھ کو صحابۂ کرام کے قدم چومنے کا بھی شرف حاصل ہوا ہے جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام کا حقیقی اور نیا زاویہ سامنے آیا ہے۔

مولانا محترم کی سرزمین سندھ سے محبت اور عقیدت کا یہ عالم ہے کہ کل فرما رہے تھے کہ تاریخ سندھ لکھنے کے جنوں میں تصور ہی تصور میں میں نے بزرگان سندھ،

محدثین، فقہاء اور اولیاء کرام سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں اور سندھ کے میدانوں، سبزہ زاروں، پہاڑوں، مکران کی وادیوں اور ریگزاروں میں منازل طے کی ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے آج مولانا محترم عالم بیداری میں بنفس نفیس اہل سندھ سے ملاقات کررہے ہیں۔

ہمارے آباء واجداد کا یہ بیش بہا سرمایہ پیش کر کے مولانا محترم نے بڑا احسان کیا ہے، اس لئے ہم ان کو محسن سندھ قرار دیتے ہیں۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب نے کہا:
قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اشرف المخلوقات کو استحکام بخشنے کے لئے پہاڑ قائم کیا ہے۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی اپنی کتاب ''عرب وہند عہد رسالت میں'' اور دوسری کتابیں لکھتے وقت علم ودانش اور دوسرے مبارک واقعات کے چھوٹے چھوٹے ذرے جمع کر کے پہاڑ قائم کردیے ہیں، اور پورے عالم اسلام کو استحکام فراہم کر کے بیش قیمت خزانہ فراہم کیا ہے۔

ڈاکٹر ایاز حسین قادری صدر شعبۂ سندھی، کراچی یونیورسٹی نے کہا کہ اس کتاب کا عنوان ''عرب وہند عہد رسالت میں'' کے بجائے ''عرب وسندھ عہد رسالت میں'' ہونا چاہئے تھا، کیونکہ زیادہ مواد سندھ کے بارے میں ہے۔

پروفیسر ذیشان خٹک وائس چانسلر گومل یونیورسٹی پیشاور نے کہا کہ: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی تصانیف پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو مرتب کرنے میں بڑی عرق ریزی کی ہے، یہ بات ان کی کتابوں کے حوالے سے ملتی ہے کہ قدیم زمانے میں سندھ ایک بڑا ملک تھا جس کی سرحدیں ایک طرف کابل اور دوسری طرف بمبئی سے ملی ہوئی تھیں۔

ممتاز قانون داں جناب خالد ایم اسحاق صاحب نے کہا کہ: تاریخ عظمت کا نشان ہوتی ہے، جو فرد کو راہ بتلاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلافت عباسیہ کے بعد اب

تک کے حالات اور واقعات کو مکمل؛ کرنے کا کام باقی ہے جو حکومت سندھ کی سرپرستی مین ہونا چاہئے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے انگریزی اور سندھی ترجمے کی ضرورت پر بھی انھوں نے زور دیا۔

تقریب کے صدر سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ نے کہا کہ: مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بیش بہا کتب لکھ کر تاریخ میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا ہے، انھوں نے مسلمانان عالم اور پاکستان کے عوام کی ان کتب کے ذریعے جو خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے، انھوں نے مولانا سے کہا کہ وہ تاریخ اسلام سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنے کام میں مزید وسعت پیدا کریں۔ آخر میں وزیر اعلیٰ نے کہا کہ عباسی دور کے بعد سے اب تک سندھ کی تاریخ قلمبند کرنے کا کام باقی ہے۔ اگر کوئی اس کام کا بیڑا اٹھائے تو حکومت سندھ اس کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہے۔

اخیر میں تقریب کے مہمان خصوصی مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کا نام اس لئے دیا ہے کہ اپنے بیرون ملک کے دوروں کے دوران مجھے یہ تاثر ملا کہ وہاں کے لوگ بھارت، پاکستان اور بنگلادیش میں رہنے والوں کو صرف انڈین تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۵۵ء میں حج کے موقع پر مقدس مقامات پر جا کر میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی تھی کہ وہ مجھ سے اسلام کی خدمت کا کام لیں۔ چنانچہ میری کوشش اور محنت کے بغیر تنظیم فکر ونظر کے زیر اہتمام یہ کتابیں بڑی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شائع ہوئیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نیک کام میں معاونت کرنے والوں کو بھی اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆☆